بیسٹ لائف نوٹس

(زریں ملفوظاتِ حیات)



انتخاب : ہالہ ارشد

تصنیف : میاں وقار الاسلام

MIAN WAQAR UL ISLAM | PRINCIPAL CONSULTANT - MARVEL SYSTEM | MARVELSYSTEM.COM
FOUNDER | WAQAR-E-PAKISTAN - LITERARY RESEARCH CLOUD | WWW.WAQARPK.COM

بیسٹ لائف نوٹس

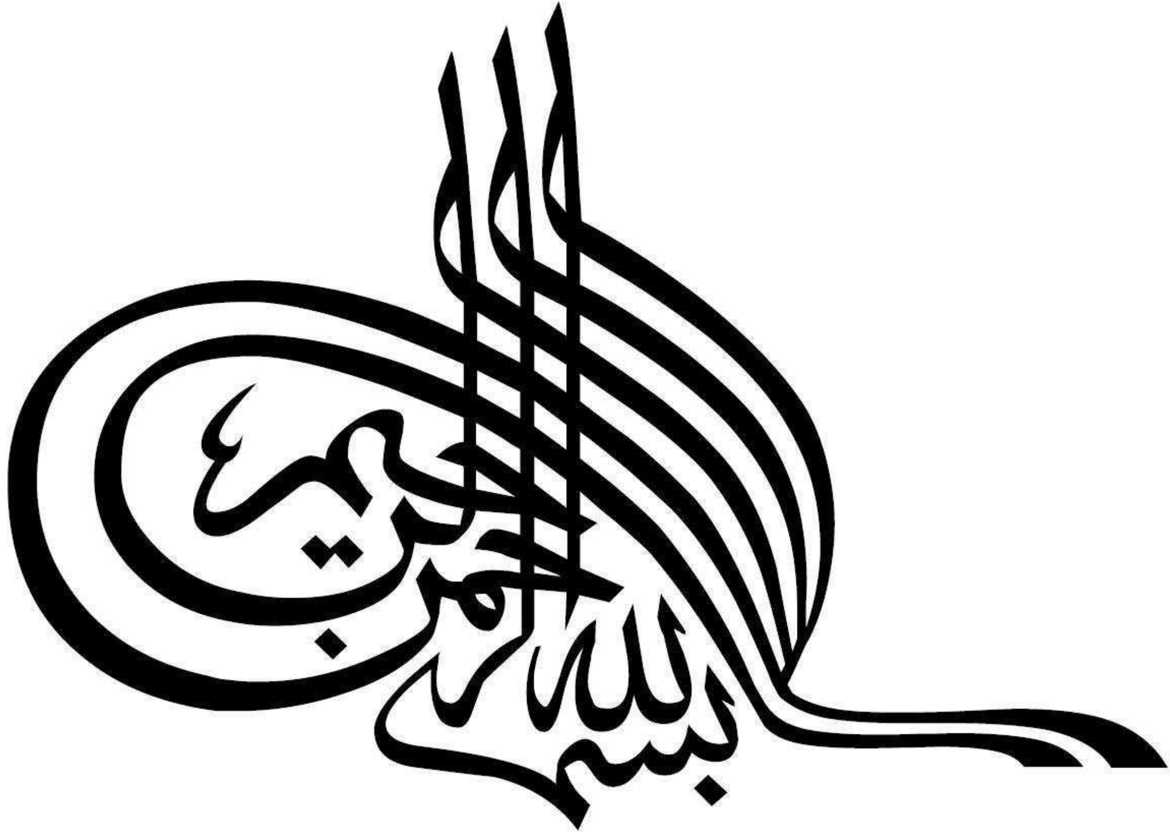
(زریں ملفوظاتِ حیات)

BEST LIFE NOTES

BY: MIAN WAQAR UL ISLAM

Compiled By

HALA ARSHAD



In the name of Allah,
the Most Beneficent,
the Most Merciful

انتساب

میرے والدین اور تمام ہم سفر دوستوں ، استادوں ، قلمکاروں اور معاونین کے نام جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں خود سی پڑھ اور لکھ سکوں، اور زندگی میں آگے بڑھ سکوں۔

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں	
کتاب کا نام	بیسٹ لائف نوٹس (زریں ملفوظاتِ حیات)
مصنف	میاں وقار الاسلام
انتخاب	ہالہ ارشد
معاون	مارول سسٹم
برقی اشاعت	2024
ناشر	وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ



WAQAR-E-PAKISTAN

WWW.WAQARPK.COM

فہرست مضامین

تصنیف : بیسٹ لائف نوٹس

مصنف : میاں وقارالاسلام

انتخاب : ہالہ ارشد

پس منظر

میرا نام ہالہ ارشد ہے، میرا آبائی شہر میلسی ہے، بنیادی تعلیم میں نے اپنے آبائی شہر سے ہی حاصل کی۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ملتان کا رُخ کیا۔ دی وومن یونیورسٹی ملتان سے بی۔ ایس اسلامک سٹڈیز کی حال ہی میں ڈگری مکمل کی۔ بچپن سے پڑھنے پڑھانے کا تھوڑا بہت شوق تھا کیونکہ والدہ ٹیچر تھیں اِس لیے گھر سے ہی تعلیمی اور تدریسی ماحول ملا۔ والدہ کے ساتھ گھر پر بچوں کو بھی پڑھاتی رہی اور پھر اِسی شوق کو آگے بڑھاتے ہوئے کوشش کی کہ کسی تعلیمی ادارے میں بھی پڑھا سکوں۔ ٹیچر بننے کی خواہش بھی پوری ہو گئی اور کچھ عرصے سے مقامی سکول میں باقاعدہ پڑھا بھی رہی ہوں اور تعلیمی ادارے کی کچھ اور سرگرمیوں کو دیکھ بھی رہی ہوں۔

زیادہ تر اِسلامی اور تاریخی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، اور ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا اَدب کو بھی پڑھا۔ خود سے لکھنے کی خواہش ضرور تھی مگر یہ ایک مشکل کام لگتا تھا۔ کبھی کبھی ٹوٹا پھوٹا لکھا بھی مگر اپنا لکھا کبھی متاثر نہ کر سکا۔ شاید کہیں دبے دبے سے شوق تھے، تھے بھی یا نہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوا۔

کتابیں جمع کرنے کا ہمیشہ سے شوق تھا کیونکہ گھر میں پہلے سے ہی بہت سی کتابیں موجود تھیں، میرے نانا جان جن کا نام محمد فیض بخش تھا، ایک عالمِ دین کے ساتھ ساتھ اُستاد بھی تھے جو مدرسے میں بچوں کو قرآن مجید اور دینی کُتب کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور یہ سلسلہ صرف مدرسے تک محدود نہیں تھا بلکہ گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی جن میں سینکڑوں دینی کُتب موجود ہوتی تھیں نہ صرف دینی کُتب بلکہ اَدب سے بھی اچھا خاصا لگاؤ رہا اُن کو اپنی زندگی میں۔

گھر میں مجھے نانا کی جمع کی گئی کتب میں دینی کتابوں کے ساتھ اَدب کی کتابیں بھی مل جایا کرتی تھیں جن میں مختلف نامور مصنفوں کے ناول اور بہت سے شاعروں کی شاعری کی کتابیں شامل تھیں جنہیں میں بس وقت گزاری کی حد تک کبھی کبھار پڑھ لیا کرتی تھی اور یہ کبھی کبھار کا سِلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ کب عادت میں اور شوق میں تبدیل ہوگیا پتہ ہی نہیں چلا، نانا کی جمع کی ہوئی کتابوں کے ساتھ میں آجکل کے نئے لکھنے والوں کی کتابوں کو بھی پڑھنے لگی، جن میں سرِفہرست محترمہ نمرہ احمد نیازی، محترمہ عمیرہ احمد، محترمہ سمیرا حمید، محترمہ فرحت اِشتیاق، محترمہ ہُما مختار احمد، ڈاکٹر شہناز مزمل، محترمہ تسنیم کوثر، جناب میاں وقارالاسلام، جناب ڈاکٹر سلطان محمود اور جناب ہاشم ندیم خان کے نام شامل ہیں، اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میں بہتر سے بہتر کی تلاش میں مزید دوسرے لکھنے والوں کی تصانیف بھی پڑھنے لگی یوں سیکھنے سکھانے کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا سے بہت زیادہ شناسا نہیں تھی، مگر وقت کی ضرورت کے مطابق سیکھنا تو تھا ہی، اور پھر سکول کے کاموں میں یا یونیورسٹی کے کاموں میں کمپیوٹر اور سوشل میڈیا کی سمجھ بوجھ نہ ہونا ایک قسم کی معذوری محسوس ہوتی تھی، کچھ سہیلیوں سے سیکھا، کچھ سکول اور کالج کے ٹیچرز سے سیکھا اور کچھ ماموں سے سیکھا مگر یہ سب کافی نہیں تھا کہ وقت کی ضرورت کو پورا کرسکے، مگر اس سے تھوڑا بہت سلسلہ شروع ہوگیا، ہاتھ میں لیپ ٹاپ آئی تو اس کی اہمیت اور زیادہ محسوس ہونے لگی۔

کچھ دوستوں سے پتہ چلا کہ جناب میاں وقارالاسلام بانی وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ، اینڈ پرنسپل کنسلٹینٹ مارول سسٹم، آئی ٹی کے بھی ماہر ہیں، اور آن لائن بھی بہت سے پراجیکٹس مینیج کرتے ہیں، اور ان کا ادب کے ساتھ بھی گہرا تعلق اور پرانا رشتہ ہے، مذید رہنمائی کے لیے ان سے ملنا ضروری تھا، مجھے اپنی فیلڈ میں اور خاص کرکے کمپیوٹر کی مہارت حاصل کرنے کے لیے کیا سیکھنا چاہیے کون کون سے کورسز کرنے چاہئیں، کون کون سے سافٹ وئیرز آنے چاہیں اور کہاں سے کروں جو آگے جا کر مجھے میرے کیریئر میں فائدہ بھی دیں اور میری تعلیم میں بھی مجھے سپورٹ کریں، اور کیا ہی اچھا ہو اگر میں خود کچھ سیکھ کر کمانے بھی لگوں۔

ایک آدھی ادھوری سرسری سی ملاقات، انہوں نے چند سوالات کئے اور مجھے ایسے لگا کہ مجھے کچھ بھی نہیں آتا، پتہ نہیں میں اس فیلڈ میں چل بھی سکتی ہوں یا نہیں۔ انہوں نے بہت بنیادی چیزیں بتائیں، مگر وہ بھی اتنی تفصیل سے بتائیں کہ مجھے لگا اس میں بھی سال لگ جائے گا۔ میں پہلے سے سہمی ہوئی لڑکی اور زیادہ سہم گئی، انہوں نے کچھ انگریزی اور کچھ اردو کی کتابیں دیں اور کہا پہلے اچھے سے ٹائپ کرنا اور تھوڑا بہت کمپوز کرنا سیکھیں،

دو چار صفحات اردو کے اور دو چار صفحات انگریزی کے ٹائپ بھی کریں، کمپوز بھی اور پوسٹ کارڈز بھی بنائیں اور پھر مجھے بھیج دیں، معلوم تو ہو کہ ٹائپ یا کمپوز وغیرہ کچھ کرنا بھی آتا ہے یا نہیں۔ باقی چیزیں اس کے بعد دیکھیں گے۔

کچھ دن تو سمجھ ہی نہیں آیا کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ پھر ایک دن انہوں نے خود ہی پوچھ لیا کہ میں نے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اور کچھ مضامین بھی بھیج دیے کہ میں پڑھوں اور سمجھنے کی کوشش کروں۔ میں نے کہا مجھے اسلامی مضامین پڑھنے کا شوق ہے تو انہوں نے چند اسلامی مضامین بھی بھیج دیے۔ اور پوچھا کہ کبھی اس طرح سے قران کو پڑھا ہے۔ یہ مضامین اتنے متاثر کن تھے کہ میں نے انہیں بار بار پڑھا اور کہا کے مجھے اسی طرح کے اور مضامین پڑھنے ہیں کیوں کہ میں جس طرح سے قران کو سمجھ رہی تھی یہ وضاحتی مضامین کچھ اور ہی منظر پیش کر رہے تھے۔ تھا تو سب کچھ قران مجید سے ہی مگر انہیں سمجھنے کا اور پھر سمجھانے کا انداز کچھ مختلف تھا۔

میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکی کہ آخر یہ مضامین کیا ہیں، یہ کیا سلسلہ ہے، یہ کیوں لکھے گئے اور ان میں اتنی شدت کیوں ہے۔ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ بیسٹ لائف نوٹس کے نام سے ایک سیریز ہے جس میں اس طرح کے اسلامی مضامین شامل ہیں۔ تو میں نے پوچھا یہ بیسٹ لائف نوٹس کیا ہیں۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ نوٹس پہلے تو وہ تھے جو کمپائل کیے گئے، بہت سے لوگوں کے تجربات اور مشاہدات سے، اور پھر ایسے لوگوں کے مشاہدات اور تجربات سے جن کا تعلق ان کی یعنی میاں وقارالاسلام کی زندگی سے تھا۔ اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس کے دوسرے مرحلے میں انہوں نے اپنے مضامین لکھے اور اپنے آپ کو ایک قلمکار کے طور پر منوایا۔

مجھے بیسٹ لائف نوٹس کی کہانی مکمل طور پر سمجھ تو نہیں آئی مگر دلچسپ ضرور محسوس ہوئی اور میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق آسان آسان مضامین پڑھنے شروع کر دیے، اور جہاں مشکل ہوتی وہاں رہنمائی بھی لے لیتی۔ میری دلچسپی دیکھ کر میاں وقارالاسلام صاحب نے کہا کہ تم یوں کرو کہ ان مضامین کو پڑھو اور جو اچھے لگیں انہیں ایک جگہ جمع کر لو۔ ان کی ایک فائل بناؤ تا کہ تمہیں ٹھیک سے ایک کتاب کو تیار کرنا آ جائے اور کتابوں پر تبصرہ کرنا بھی آ جائے۔ کتابوں پر رائے کا اظہار تو میں پہلے بھی کرتی تھی، مگر اس طرح سے کسی کتاب کو پڑھنا، سمجھنا، مضامین کو الگ کرنا، ترتیب دینا، اس پر اپنی طرف سے مضامین لکھنا، پھر اپنے بارے میں لکھنا پھر ان میں سے کوٹس کو الگ سے نکالنا انہیں کمپوز کرنا، معلوم نہیں ہوا مجھے کہاں پھنسا دیا گیا اور مجھ سے کیا کام لیا جانے لگا۔

جو لوگ یہ کام سمجھتے ہیں ان کے لیے شاید یہ دو سے تین دن کا کام ہو مگر مجھے ہفتے لگ گئے اور سر وقار اکثر یہی کہتے تھے کہ اگر سپیڈ نہیں تو سمجھیں یہ کوئی مہارت نہیں۔ اور اگر سپیڈ زیادہ ہے اور باقی سب سے بہت زیادہ ہے تو یہ ایک بہت بڑی صلاحیت ہے جس کا اندازہ آپ کو شاید ابھی نہ ہو۔ تو میں کرتی چلی گئی جو مجھ سے کروایا گیا، اور جتنا مجھ سے ہو پایا۔

ایک طرف تو میں ہزار ہزار صفحات کی دو کتابیں سَرسَری سَرسَری سی پڑھ گئی، اور دوسری طرف مجھے اِن میں سے مضامین کو الگ کرنا اور ترتیب دینا آنے لگے، اور تیسری طرف مجھے لفظوں اور محاوروں کی پہچان بھی ہونے لگی۔ مشکل اور بیزار کرنے والی چیزیں بھی کچھ کچھ دلچسپ لگنے لگیں۔ مگر سپیڈ نہیں تھی، مگر انہوں نے کبھی میری حوصلہ شکنی بھی نہیں کی، انہوں نے مجھے کھلا وقت دیا کہ جتنا آسانی سے ہو سکے میں کرتی جاؤں۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ اگر تھک جائیں اور بیزار ہو جائیں تو بالکل نہ کریں۔ کام وہ کریں جو اچھا لگے اور جسے کرنے میں خوشی محسوس ہو، ورنہ صرف وقت ہی ضائع ہو گا۔ آپ کی محنت نہ آپ کے کام آئے گی اور نہ کسی اور کے۔

جب میں نے تھوڑے بہت مضامین پڑھ لیے اور تھوڑا بہت ٹائپ بھی کر لیے اور تھوڑا تھوڑا لکھنے بھی لگی، تو پھر میرا آمنا سامنا ہو گیا، مجھے لگا میں اب پہلے سے بہتر بات کر سکوں گی، مگر نہیں۔ مجھے کہتے ہیں ایک مضمون کو پڑھ کر سناؤ، اب یہ کام تو اس سے بھی مشکل تھا، کچھ میری آواز پہلے ہی بیٹھی ہوئی تھی کچھ ان کے سامنے اور بیٹھ گئی، اور وہ کہتے رہے آواز کو اُٹھاؤ، وہ ایک لفظ استعمال کرتے تھے لاؤڈ اینڈ کلئیر، اور میرے پاس یہی دو لفظ نہیں تھے۔ اور ملاقات لاؤڈ اینڈ کلئیر پر ہی ختم ہو گئی۔

مجھے معلوم نہیں اپنی باتوں میں لاؤڈ اینڈ کلئیر کبھی ہو پاؤں گی یا نہیں، مگر مجھے ان کی بات لاؤڈ اینڈ کلئیر سمجھ آ گئی، کہ اگر میں زندگی میں لاؤڈ اینڈ کلئیر نہ ہو پائی تو شاید کچھ بھی نہیں کر پاؤں گی۔

بیسٹ لائف نوٹس سے مجھے کچھ چیزیں لاؤڈ اینڈ کلئیر ملیں، اور جیسے ہی نظر سے گزرتی گئیں میں نے اِن مضامین کو بھی الگ کر لیا، اور ان مضامین سے کوٹس کو بھی الگ کر لیا۔ اُمید کرتی ہوں کہ شاید میں اپنی بات لاؤڈ اینڈ کلئیر کر پاؤں یا نہیں مگر میں بیسٹ لائف نوٹس پر لاؤڈ اینڈ کلئیر بات کروں گی۔

سب سے پہلے تو میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آخر یہ بیسٹ لائف نوٹس ہیں کیا؟ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ بیسٹ لائف نوٹس ایک ایسی کتاب ہو گی جو زندگی کے بہترین تجربات اور مشاہدات یا پھر واقعات کو مختلف انداز میں پیش کرے گی۔ اکثر موٹیویشنل کتابوں میں ایسا ہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک موٹیویشنل کتاب تو ہے مگر اس کی وسعت بہت زیادہ ہے، وہ کچھ اس طرح سے کہ اس میں زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسلام کی بات کریں تو اس میں بہت سے اسلامی مضامین ہیں، اور اگر ادب کی بات کریں تو اس میں ادب کے مختلف پہلوں پر بات ہوئی ہے۔ اور اگر تعلیم و تدریس پر بات کریں تو اس میں بہت کچھ ملتا ہے۔

بات یہاں ختم نہیں ہوتی، اگر پروفیشنل لائف کی بات کی جائے یا سوشل لائف کی بات کی جائے تو اس میں اس کا بھی ذکر ہے۔ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، اور سیاست پر بھی کھل کر بات کی گئی ہے۔ صرف سی پیک اور گوادر پر ہی بات نہیں کی گئی بلکہ بین الاقوامی ایشوز کو بھی بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ دِلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ صرف مسائل پر ہی بات نہیں کی گئی بلکہ مسائل کے حل کے حوالے سے بھی کوشش کی گئی ہے۔ انسانی رویوں پر بھی بات کی گئی ہے اور سوشل اور کلچرل ویلیوز پر بھی بات کی گئی ہے۔ اور بہت سے پہلو ہیں شاید سب پر بات کرنا میرے لیے ممکن نہ ہو یا پھر یہ کہ کسی پہلو پر بات کرتے ہوئے میں کچھ الٹا سیدھا لکھ بیٹھوں۔ مجھے صرف وہ لکھنا ہے جو مجھے میری کیپیسٹی میں لاؤڈ اینڈ کلئیر محسوس ہو۔

میں شکریہ ادا کرتی ہوں اپنے استاد میاں وقارالاسلام صاحب کا جنہوں نے مجھے بیسٹ لائف نوٹس سے متعارف کروایا، اور مجھے اس کے مضامین شئیر کیے تاکہ میں ان سے کچھ سیکھ سکوں۔ بیسٹ لائف نوٹس میں قرآن سے متعلق واقعات نے سب سے زیادہ متاثر کیا، میں نے کبھی بھی قرآن کو اِن حوالوں سے نہیں پڑھا تھا جیسے بیسٹ لائف نوٹس میں لکھا گیا ہے۔ قرآن کی آیات کا اپنی ذات سے موازنہ کرکے پڑھنا اور سمجھنا ایک خوبصورت احساس ہے جس کا مجھے اِس کتاب میں موجود مختلف مضامین کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا۔

اس کے علاوہ بہت سی باتیں ہیں جن کا میں نے گہرا اثر لیا ان میں سے چند باتوں کا ذکر میں یہاں ضرور کرنا چاہوں گی۔

جن جن مضامین نے سب سے زیادہ میرے دِل کو چُھوا ہے، اور جن جن مضامین سے میں نے خود بہت کچھ سیکھا ہے، ان تمام مضامین کو میں نے ایک ساتھ الگ سے اِس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

بات اگر قرآن کی ہو، حیا کی ہو، عزت کی ہو، پردے کی ہو، تہذیب، ثقافت یا تربیت کی ہو، کامیابی یا ناکامی کی ہو، رِشتوں میں خلوص یا اِحترام کی ہو اور یہاں تک کہ مُحبت کی ہو، اِس کتاب میں موجود مضامین میں ہر ہر پہلو پر بڑے وضاحت اور خوبصورتی سے روشنی ڈالی گئ ہے۔

یہ کتاب علم کی قدر کرنے والوں کیلئے ایک بہت قیمتی اثاثہ ہے، یہ کتاب ایک خزانہ ہے جس میں ہر مضمون کی اپنی ایک حیثیت اور چمک ہے، جو ہر طالبِ علم کے دِل اور دماغ کو روشن کر سکتی ہے۔

بات حاصل کی کی جائے یا لاحاصل خواہشات کی، اِن مضامین میں زندگی کے ہر رنگ کو ڈسکس کیا گیا ہے۔

اگر میں کچھ اپنی زندگی کے پسِ منظر میں جھانکوں تو مجھے اپنی زندگی میں جو سب سے خوبصورت وقت لگا وہ وقت اپنے نانا جان کے ساتھ گزارا ہوا وقت لگا، میں نے اپنے نانا کے ساتھ جن کا نام محمد فیض بخش ہے، بہت کم وقت گزارا ہے لیکن جتنا وقت بھی اُن کے ساتھ گزرا وہ سب آج بھی یاد ہے، میں بہت چھوٹی تھی اُس وقت لیکن جو باتیں ہماری رُوح میں شامل ہو جائیں وہ کبھی نہیں بھولا کرتیں۔

مجھے یاد ہے رات میں سونے سے پہلے وہ مجھے اپنے ساتھ لیٹا کر مختلف کہانیاں سُنایا کرتے تھے، جن میں اولیاء کرام کا ذکر ہوتا تھا، پیغمبروں کے قصے آسان الفاظ میں کہانیوں کی صورت میں سُنانا، اور کوئ بھی ایک اچھی بات اُن کہانیوں کے نتائج کی صورت سمجھا دینا، نانا تو کچھ وقت کے بعد اِس دنیا سے چلے گئے لیکن اُن کی جمع کی ہوی کتابیں الماریوں کی زینت بن گئیں، اور سُنائی ہوئی کہانیاں ہمارے دِل و دِماغ میں نقش ہو گئیں۔

یہ کہانیوں کا سِلسِلہ وہیں ختم نہیں ہوا، میری خالہ جن کا نام آسیہ فیض بخش ہے، مجھے اور میرے تمام کزنز کو بیٹھا کر ہمارے سامنے اِسلامیات اور اردو کے سبق پڑھا کرتیں تھیں جو ہماری نصاب کی کتابوں میں شامل ہوا کرتے تھے، ان کا انداز نانا سے مختلف تھا لیکن میرے اندر وہ عادت جو کہانیاں سننے کی تھی وہ خواہش اِس طرح پوری ہو جایا کرتی تھی، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میں خود سے کتابیں پڑھنے لگی وہ بچپن میں کہانیاں سُننے کی عادت

کہانیاں پڑھنے میں تبدیل ہوگئی، ناولز پڑھنا شروع کر دیئے اور اِس کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو تلفظ بہتر ہوگیا، الفاظ کی ادائیگی کا انداز بدل گیا جو مزید خوبصورت ہوگیا، اور کہانیوں سے جو لگاؤ تھا وہ ناولز پڑھنے سے اور زیادہ بڑھ گیا۔

پھر یہ سلسلہ دوستوں تک پھیل گیا میری دوست جو بچپن سے میرے ساتھ ہے ہر لمحہ جس کا نام سُنینہ احمد ہے، اُس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ میں کتابیں پڑھتی ہوں ناولز پڑھتی ہوں اُسے بھی کوئی کہانی سُناؤں، میں اُن دنوں جو ناول پڑھ رہی تھی اُس کا نام "جنت کے پتے" جس کو نمرہ احمد نیازی نے لکھا ہے۔

میں وہ ناول پڑھتی تھی اور سُنینہ وہ ناول سُنتی تھی، اُس وقت ہم دونوں فرسٹ ائیر کا سمر کیمپ اٹینڈ کر رہے تھے اور ان 3 ماہ کے عرصے میں یہ سلسلہ جاری رہا میں مختلف کتابیں پڑھتی تھی اور سُنینہ سُنا کرتی تھی جب بھی ہمیں کالج میں کوئی فارغ وقت ملتا تھا، سُنینہ کو کہانیاں سُننا پسند تھا اور مجھے کہانیاں پڑھنا۔

پھر جیسے جیسے وقت گزرا سُنینہ اور میرے اگلی کلاس میں مضامین بدل گئے اور ہم الگ ہوگئے، لیکن میرے شوق نہیں بدلے میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا اور ملتان چلی گئی اور میری کتابیں بھی میرے ساتھ ساتھ، جہاں میں جاتی تھی میری کتابیں میرے ساتھ ہوتی تھیں، اِن کتابوں کی عادت نے لوگوں کو مجھ سے جوڑ دیا اور میں جو ہاسٹل میں رہنے کی بلکل عادی نہ تھی وہاں بھی میرے بہت سے لوگ اِن کتابوں کی وجہ سے میرے دوست بن گئے جو مجھ سے کتابیں لے کر پڑھنے لگے، اور اُنہوں نے مجھے بتایا کہ گھر سے دُور اور ماں باپ سے دُور اگر رہنا پڑ جائے کبھی تو کیسے خود کو سنبھالا جاتا ہے، اچھے دوستوں کی کمپنی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی، یہ اِحساس مجھے اُس وقت ہوا جب مجھے گھر سے دُور رہنے کا موقع ملا۔

ہماری پیدائش سے لے کر ہماری موت تک جو ایک چیز اللہ نے ہم پر ہر طرح سے فرض کر دی ہے، وہ ہے عِلم کا حاصل کرنا۔ جو کہ کبھی بھی پُرانا نہیں ہو سکتا، آپ عمر کے جس بھی حصّے میں ہیں، جو ایک چیز آپ ہمیشہ حاصل کر سکتے ہیں اور جس کی اِجازت آپ کے خالق آپ کے رَب نے آپ کو دی ہے وہ ہے علم حاصل کرنا، غور و فکر کرنا۔ اِنسان جب پیدا ہوتا ہے اُسی وقت سے اُس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے دِن گزرتے ہیں وہ چھوٹا پیدائشی بچہ الگ الگ مراحل سے گزرتا ہے جس میں لوگ اُس کی مختلف انداز سے مدد کرتے ہیں، بچپن سے ہم اپنے گھر میں ماں باپ کو بڑے بہن بھائیوں کو اور مختلف رِشتوں کو کچھ نہ کچھ کرتے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور وہ چیزیں ہم اپنے اندر جذب کر رہے ہوتے ہیں، ہم سیکھ رہے

ہوتے ہیں، اور میں سمجھتی ہوں میں نے اپنی زندگی میں جس بھی اِنسان سے اگر کچھ بھی سیکھا ہے چاہے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہی کیوں نہ ہو وہ شخص میرا اُستاد ہے۔

ایسا ہو ہی نہیں سکتا کبھی کی ہم جو کر رہے ہوں وہ ہم خود سے کر رہے ہوں، ہم کسی نہ کسی کو ضرور وہ سب کرتے دیکھتے ہیں اور وہ سب ہم نے اُسی شخص سے سیکھا ہوتا ہے جسے ہم نے دیکھا تھا۔

اِس کی سب سے خوبصورت مثال ہمارے پیغمبر کی ہے کہ کِن کِن مراحل سے اُن کو کِس کِس طرح سے گزارا گیا اللہ پاک کی طرف سے اور اُن کو علم سیکھایا گیا، کوئی پیغمبر بھی ماں کے پیٹ سے علم لے کر نہیں آیا ہر نبی کو اللہ پاک نے دُنیا میں آنے کے بعد علم سیکھایا اور مختلف مراحل سے گزار کر سیکھایا، جیسے علامہ اِقبال نے کہا ہے

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

سِکھائے کس نے اِسماعیل کو آدابِ فرزندی؟

ایک اِنسان پیدائش سے لے کر جب تک وہ زندہ رہتا ہے تب تک وہ اپنی زندگی میں بس سیکھ رہا ہوتا کچھ اپنے ماحول سے، کچھ مختلف دَرس گاہوں سے اور ہر جگہ اُس کا سامنا اُستاد سے ہوتا ہے، کوئی راہ چلتے کوئی بات سَمجھا دیتا ہے، اور کبھی کسی کے کئے اچھے عمل سے کچھ سیکھ جاتے ہیں، سکول، کالج، یونیورسٹیوں یا مدارِس میں ہر جگہ ہمیں استاد ملتے ہیں اور بہت ملتے ہیں، لیکن کچھ استاد ایسے ہوتے ہیں جو اپنا آپ ہمارے ذِہن میں نقش کر دیتے ہیں، اُن اُستادوں کی دِل میں ایک الگ جگہ ہوتی ہے۔

میری زندگی میں آنے والے تمام اُستادوں میں ایک استاد ایسے ہیں جن سے دِلی طور پر میں قریب ہوں اور وہ ہیں وقارالاسلام صاحب۔ میری زندگی میں آنے والے ایسے شخص جو سب سے قریب ہو گئے میرے جن سے چند دِنوں میں مجھے الگ ہی اُنسیت ہو گئی ہے، میں کبھی اِتنی ذہین اور محنتی نہیں تھی لیکن سر نے مجھے بتایا کہ کام کیسے کیا جاتا ہے محنت کیسے کرتے ہیں۔ اُنھوں نے میرے ہر غلط کام پر بھی مجھے شاباش دی ہے تاکہ میں مایوس نہ ہو جاؤں اُنھوں نے ہمیشہ مجھے آگے بڑھنے کا اچھا سوچنے کا حوصلہ دیا ہے، میری سوچ کا دائرہ محدود تھا اُنھوں نے میری سوچ کو بدل دیا ہے

میری محدود سوچ کے دائرے کو جس کے مدار میں بس چند خواہشات گردش کرتی تھی، لیکن اُن خواہشات کو پورا کیسے کیا جاتا ہے، یہ وقار سر نے سمجھایا ہے مجھے۔

انہوں نے میرے اُن سوچوں کے محدود دائرے کو لامحدود انداز میں وسیع کر دیا ہے۔اَب اُن کی وجہ میں بہت اچھا سوچتی ہوں، بہت اچھا پڑھتی ہوں، بہت اچھا بول سکتی ہوں، میرے خوابوں کو تکمیل تک پہنچانے میں آپ کا بہت اہم کِردار ہے وقار سر، آپ کی ہمیشہ میرے دِل میں ایک بہت اچھے اُستاد کی حیثیت سے ایک الگ ہی جگہ رہے گی، اِس کتاب کو کمپائل کرنے کا خیال مجھے کبھی نہیں آ سکتا تھا، اگر آپ کا ساتھ نہ ہوتا، ہالہ آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہے گی، آپ کیلئے ہمیشہ دُعا گو رہے گی، آپ سلامت رہیں، صحت و تندرستی اور خوشیوں سے بھر ہور لمبی زندگی پائیں ۔آمین

مختصر تعارف : میاں وقارالاسلام

مصنف : بیسٹ لائف نوٹس

میراآبائی شہر:

میراآبائی شہر میلسی ہے، جو کہ ملتان کا ایک قدیم شہر ہے اور ضلع وہاڑی کی تحصیل ہے۔ میلسی زراعت کے حوالے سے اپنی بہترین پہچان رکھتا ہے، یہ علاقہ مہندی، گندم، کپاس، چاول، گنا، مکئی، آم، مالٹا، فالسہ، جامن، کھجور جیسی بہت سی نعمتوں سے مالامال ہے۔ میلسی شہر میں سڑکوں، نہروں، اور ریلوے کا وسیع نیٹ ورک موجود ہے، دریائے ستلج اور سائفن بھی شہر کی اہمیت کو دوبالا کرتے ہیں، پبلک پرائیویٹ ٹرانسپورٹ، میلسی بار کونسل، پبلک پرائیویٹ ہسپتال، طلبہ اور طالبات کیلیئے بہترین سرکاری اور نجی ادرے، کمیٹی باغ اور سپورٹس کمپلیس بھی موجود ہیں۔ زراعت کے ساتھ ساتھ پولٹری، فیشری اور لائیو سٹاک فارمنگ بھی علاقے کی معشیت میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ میرا تعلق یہاں کی آرائیں فیملی سے ہے، جو کہ اس علاقے میں پندرویں صدی سے آباد ہیں۔ حکیم میاں جلالادین لاہوری نے اہم مغلیہ منصب کو خیر باد کہہ کر اس علاقے میں رہائش اختیار کی۔

مختصر تعارف:

نام : میاں وقارالاسلام، شاعر، ادیب، کارپوریٹ ٹرینر، بزنس کنسلٹینٹ

پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم، فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم

ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ آف کمپنیز، سی ای او، سوشوآن اردو سوشل نیٹ ورک

ایڈوائزر : ادب سرائے انٹرنیشنل، کنسلٹینٹ : ایکوکیئر کنسلٹینسی سرویسز

تعلیم : بی کام، ایم بی اے، سرٹیفکیشنز : مائیکروسافٹ، سیسکو اینڈ کارویٹ سسٹم

ایوارڈز اینڈ ایچیومنٹس:

لائف ٹائم ایچیومنٹ ایوارڈز سال 2016 اینڈ 2017

نیازی گروپ آف کمپنیز، ادب سرائے انٹرنیشنل

بزنس ایکسی لینس ایوارڈز سال 2018 اینڈ 2019

ایکوکیئر کنسلٹینسی سرویسز (پاکستان)، ٹی ایس وائین (برطانیہ)

ایجوکیشنل اینڈ لیٹریری ایوارڈز سال 2019 اینڈ 2020

سائی سینس (سعودی عرب)، ہیرا فاؤنڈشن (امریکہ)

ادبی مسافت:

تعارف: شارٹ بائیو گرافی (اردو)، شارٹ بائیو گرافی (انگریزی)

مضامین: بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ دوئم (کیریئر، موٹیویشن اینڈ لاجکس)

شاعری: من کٹہرا، شہر داغدار،، سوزِ محشر، دل آج بھی مقروض ہے

ریسرچ پبلیکیشنز: مثلِ کلیات، فکرِ سلطان، عہدِ شہناز

ریسرچ پبلیکیشن سیریز: وقارِ سخن سیریز، بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ اول

گوادر ریسرچ پبلیکیشنز: گوادار نیوز بکس سیریز، گوادر ہینڈ بک

ایم نالج سیریز: شارٹ انٹرویوز، شارٹ بائیو گرافیز، پورٹ فولیوز

نیوز، اپ ڈیٹس، ریویوز: فلیپز، کوور سٹوریز اینڈ رپورٹس

پروفیشنل جرنی:

پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم، فاونڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم

ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ آف کمپنیز، سی ای او، سوشوآن اردو سوشل نیٹ ورک

ایڈوائزر: ادب سرائے انٹرنیشنل، کنسلٹینٹ: ایکو کیئر کنسلٹینسی سرویسز

الدوسر گروپ، انٹرنیشنل مارکیٹنگ مینیجر (جدہ، سعودی عرب)

کنسلٹینٹ: آئیڈیل سٹینڈرڈ کارپوریشن اینڈ شاہین گروپ (جدہ سعودی عرب)

سولو سمارٹ، ڈائیریکٹر آپریشنز (لاہور، پاکستان)

سدا بھروسہ فاؤنڈیشن، پراجیکٹ مینیجر (لاہور، پاکستان)

ساؤتھ ایشن الائنس آف میڈیکل ایکسپرٹس (ملتان، پاکستان)

کوئیک فیکس گروپ، پراجیکٹ کوآرڈینیٹر (لاہور، یواےای)

سولوسائین، اسسٹنٹ ڈائیریکٹر آپریشنز (لاہور پاکستان)

ٹاک ٹیل، اسسٹنٹ جرنل مینیجر (لاہور، ملتان، پاکستان)

نمائندہ ویب سائیٹس:

PROFESSIONAL: WWW.MARVELSYSTEM.COM

LITERARY: WWW.WAQARPK.COM

NIAZI GROUP: WWW.NIAZIGROUP.COM

ADAB SARAAE: WWW.ADABSARAAE.COM

UNIQUE SCHOOL: WWW.UNIQUESCHOOL.EDU.PK

ECOCARE: WWW.ECOCARE.PK

SOCIOON: WWW.SOCIOON.COM

بیسٹ لائف نوٹس (زریں ملفوظاتِ حیات)

دیباچہ : میاں وقارلاسلام

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو ایک کامل علم والی ذات نے بڑی حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ نہ انسان جیسا کوئی شیطان ہو سکتا ہے اور نہ ہی انسان جیسا کوئی فرشتہ ہو سکتا ہے۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو جو شرف حاصل ہے وہ پوری کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔ انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ صاحبِ ایمان ہو کر مرے یا پھر شرک کرتے کرتے اپنی جان دے دے۔ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہدایت کے راستے پر سیدھا چلے یا پھر راہِ ہدایت سے دور اوندھے منہ جا گرے۔ ربِ کائنات نے انسان کو علم حاصل کرنے کی صلاحیت دی، پھر علم حاصل کرنے کی ہدایت دی پھر اسے قدرت دی کہ وہ اس کے رازوں کو جان سکے اور یہ بھی قدرت دی کہ چاہے تو لاعلم رہے۔

بہت سے علوم کا مرکز انسان کی اپنی ذات بھی ہوتی ہے۔ مگر بہت سے لوگ علم نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ قرانِ مجید میں بار بار انسان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ساخت کو دیکھے اور سمجھے کہ اُسے کیسے بنایا گیا ہے۔ پھر قران اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ انسان تحقیق کرے اور دیکھے کہ اس کے ارد گرد کی چیزیں کیسے بنائی گئی ہیں، آسمان کیسے اُٹھا کھڑے کئے گئے ہیں، زمین کیسے بچھائی گئی ہے، پہاڑ کیسے میخوں کی طرح مضبوطی کے ساتھ گاڑھے گئے ہیں۔ چاند اور ستاروں سے آسمان کو کیسے سجایا گیا ہے، سورج کو کیسے کام پر لگایا ہوا ہے، بادل کیسے ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں، بارش کیسے برسائی جاتی ہے، پرندوں کو کون تھامے رکھتا ہے۔ موسموں کا بدلنا، دن اور رات کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا، یہ منظر یہ نظارے، ایک سے بڑھ کر ایک چیز ہے جو انسان کو حیرت میں ڈالے رکھتی ہے۔

بچوں کے پیدا ہوتے ہی ان کے دلوں میں ماں باپ کی محبت رکھ دی جاتی ہے، اور یہی محبت کی گود انسان کی پہلی درس گاہ بنتی ہے، انسان سیکھنا شروع کرتا ہے، انسان اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے رشتوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ارد گرد کے حالات اور واقعات سے سیکھتا چلا جاتا ہے۔ پھر دنیا جہان کے علوم حاصل کرنے کے بعد بھی انسان یہی سوچتا ہے کہ اسے جو علم دیا گیا ہے وہ انتہائی کم علم ہے۔ دنیا نے بہت کچھ مسخر کر لیا ہے، اتنا کچھ کہ انسانوں کی ایک جماعت کے لیے اتنا علم اُٹھانا مشکل ہے۔ بڑے بڑے کمپیوٹرز بنا لیے گئے، ٹیکنالوجی کا خوب سہارا لیا گیا، دنیا جہان کی معلومات کمپوٹرز میں محفوظ کر لی گئیں، مگر ابھی سب کچھ مسخر نہیں ہوا، ابھی بہت کچھ تبدیل ہونا ہے، ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے ابھی بہت کچھ جاننا ہے۔ انسان کا یہ سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

بیسٹ لائف نوٹس بھی شاید ایسے ہی ایک نہ ختم ہونے والے سفر کا آغاز تھا، جو علم کے حصول کی خاطر اور علم کو بانٹنے کی خواہش سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے اساتذہ، اپنے دوستوں اور اپنے محسنوں سے جو کچھ سیکھا، اسے ایک جگہ محفوظ کیا اور پھر جو کچھ مجھے مختلف کتابوں سے یا انٹرنیٹ سے بھی حاصل ہوا اسے بھی بیسٹ لائف نوٹس میں شامل کر لیا۔ کاروباری، تعلیمی، ادبی، سماجی سفر میں بہت سے ہمسفر دوستوں سے رابطہ رہا جنہوں نے نہ صرف بیسٹ لائف نوٹس کو سراہا بلکہ اس سیریز میں میں اپنا حصہ بھی ڈالا اور اپنی زندگی کے بہترین تجربات سے آگاہ بھی کیا۔ اس طرح کم و بیش تین سالوں میں بیسٹ لائف نوٹس کی پہلی 10 جلدیں مکمل ہوئیں اور ڈیجٹل بک کی شکل میں ویب سائٹ پر محفوظ کر لی گئیں۔ جن دوستوں نے بیسٹ لائف نوٹس میں اپنا حصہ ڈالا، انہیں علمی اور ادبی کنٹریبیوشن کے سرٹیفکیٹ بھی جاری کئے گئے۔

بیسٹ لائف نوٹس کی پہلی سیریز میں میرا بنیادی کردار ایک مرتب کا تھا، نہ کہ ایک قلمکار کا۔ جبکہ بیسٹ لائف نوٹس کی دوسری سیریز میں میرا کردار ایک قلمکار کا ہے نہ کہ ایک مرتب کا۔ بیسٹ لائف نوٹس کی دوسری سیریز کا سلسلہ بھی پہلی سیریز کے ساتھ شروع ہو چکا تھا، دوسری سیریز میں وہ مضامین شامل تھے جو میں نے خود لکھے اور انہیں مختلف اخبارات، رسائل اور بلاگز میں شائع بھی کروایا۔

بیسٹ لائف نوٹس جس کا اردو "نام زریں ملفوظاتِ حیات" بھی ہے، اس کے درج ذیل 10 ابواب ہیں۔

1) تعارفی اور اعزازی
2) اسلامی اور مذہبی
3) ثقافتی اور سماجی
4) تجارتی اور معاشی
5) علمی اور تربیتی
6) ادبی اور لسانی
7) سیاسی اور حکومتی

8) غیر ملکی اور بین القوامی

9) ذہنی اور نفسیاتی

10) اصلاحی اور تنقیدی

"بیسٹ لائف نوٹس" یا "زریں ملفوظاتِ حیات" میں وہ مضامین بھی شامل ہیں، جنہیں ریڈیو اور ویب ٹی وی پر پڑھا اور نشر کیا جاتا رہا ہے۔ بیسٹ لائف نوٹس کے تمام مضامین کی تعداد 300 سے قریب ہے۔ تقریباً 1000 صفحات کی اس سیریز کا مسودہ کتابی شکل میں مکمل چکا ہے اور اس پر نظر ثانی کر مرحلہ جاری ہے۔ ہمسفر دوستوں کی قیمتی رائے کو بھی ضرور شامل کیا جائے گا۔

آپ کی قیمتی رائے کا منتظر:

میاں وقار الاسلام

پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم

فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ

www.marvelsystem.com | www.waqarpk.com

بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات)

اظہارِ خیال: ڈاکٹر شہناز مزمل

بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات) دیکھنے میں ایک ایسا نام جس میں اپنے اور دوسروں کے تجربات شامل نظر آتے ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پہلے جو کچھ بیسٹ لائف نوٹس سیریز میں تحریر کیا گیا یا اس سیریز میں شمولیت کے لیے طلب کیا گیا وہ لوگوں کی زندگی کی بہترین یاداشتیں تھیں جو ایک جگہ جمع کی گئیں، اور لوگوں نے بیسٹ لائف نوٹس سیریز کے آغاز سے لے کر آخر تک اس سفر میں بہت تعاون کیا۔

یہ خوبصورت ادبی سفر جو شاید کچھ ارادی اور کچھ غیر ارادی طور پر شروع ہوا، اور یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی منزل کون سی ہے، اور کہاں پہنچنا ہے، کیا کرنا ہے، کس طرح کرنا ہے، لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا، اور یہ سفر اتنی تیزی سے طے ہوا کہ وقت کا اندازہ بھی نہیں ہو سکا، ویسے تو تقریبا تین سال کا عرصہ پہلی 10 جلدوں کے آنے میں لگا، لیکن کیوں کہ کام جب ہو رہا ہو تو وقت کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وقت کتنی تیزی سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

میاں وقارالاسلام کی یہ خوبی ہے کہ ان میں ارادے کی پختگی اور مستقل مزاجی ہے، جس کام کا بیڑا اُٹھا لیتے ہیں اس کے لیے تن من اور دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اور اُسے کوئی خوبصورت شکل دے کر انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور یہی خوبی بیسٹ لائف نوٹس سیریز کی بھی ہے، شروع میں تو میاں وقارالاسلام، بیسٹ لائف نوٹس سیریز میں بطور مرتب سامنے آئے اور لوگوں کے نوٹس جمع کر کے اس ادبی سفر میں شامل کرتے چلے گئے۔ پھر اس طرح سے جب بیسٹ لائف نوٹس کی 10 جلدیں مرتب ہو گئیں اور ساتھ ساتھ ان کا زندگی کے مختلف پہلوں پر لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کا تجربہ بھی ہو گیا تو انہوں نے خود مضامین لکھنا شروع کر دیے۔

یہ سفر یونہی چلتا رہا اور بیسٹ لائف نوٹس کی دوسری سیریز میں میاں وقارالاسلام بطور قلم کار کے سامنے آئے۔ ان کے مضامین اخبارات، رسائل اور بلاگس وغیرہ میں بھی شائع ہوتے اور اور ویب ٹی وی اور ریڈیوز پر بھی نشر ہوتے رہے۔ انسان جب کسی کام کا تعین کر لیتا ہے، تو مشکلیں آسان

ہوتی چلی جاتی ہیں اور منزل خود بخود سامنے آ جاتی ہے۔ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے اس مستقل مزاج شخص کی مدد اور رہنمائی فرمائی۔ اور یوں یہ سلسلہ چلتے چلے آج اپنی منزل کے بہت قریب ہے۔

آج میاں وقارالاسلام کے اپنے تحریر شدہ تقریبا300 مضامین مکمل ہو چکے ہیں، جنہیں 10 مختلف جلدوں میں محفوظ کیا جا چکا ہے۔ بیسٹ لائف نوٹس سیریز، حصہ دوئم کے مضامین کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے 10 ابواب میں تقسیم گیا ہے جن میں 1۔ تعارفی اور اعزازی، 2۔ اسلامی اور مذہبی، 3۔ ثقافتی اور سماجی، 4۔ تجارتی اور معاشی، 5۔ علمی اور تربیتی، 6۔ ادبی اور لسانی، 7۔ سیاسی اور حکومتی، 8۔ غیر ملکی اور بین القوامی، 9۔ ذہنی اور نفسیاتی، 10۔ اصلاحی اور تنقیدی ابواب شامل ہیں۔

مجھے ہمیشہ بہت خوشی ہوتی ہے، جب یہ کوئی نئی ادبی کاوش کرتے ہیں، انہیں مشورہ دینا بھی اچھا لگتا ہے، ان کے ساتھ کام کرنا بھی اچھا لگتا ہے، ان کا کام دیکھ کر بھی اچھا لگتا ہے، اور میں ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہوں کیوں کہ یہ واقعی اسی قابل ہیں کہ انہیں خوب آگے بڑھنے پر مائل کیا جائے اور یہ اسی محنت اور لگن سے اپنے کام کو آگے بڑھاتے رہیں۔ تو میں ان کے اس کام سے بہت خوش ہوں اور چاہتی ہوں کہ یہ اسی طرح کام کرتے رہیں، اسی طرح آگے بڑھتے رہیں اور اسی طرح منزلیں ان کے راستے میں آ کر ٹھہرتی رہیں۔ بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات) کے لیے بہت سی دعائیں اور نیک خواہشات۔

مادرِ دبستانِ لاہور، ڈاکٹر شہناز مزمل، چئیرپرسن، ادب سرائے انٹرنیشنل
فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ

www.shahnazmuzammil.com،www.adabsaraae.com

جب پہلی دفعہ قران پڑھا

تحریر : میاں وقارالاسلام

جب میں نے پہلی دفعہ قران ترجمے کے ساتھ پڑھا، تو سوچ میں پڑ گیا کہ یہی قران تھا جسے پڑھ کر صحابہ روتے جاتے تھے، پھر یہ سوچا کہ مجھ پہ تو ایسی کیفیت آئی ہی نہیں، پھر یہی سوچ کر قران دوبارہ پڑھنا شروع کیا، پھر وہ پہلی آیت آ ہی گئی جس پر انتہا کی رقعت قائم ہوئی اور 45 منٹ تک میں اس آیت سے آگے نہیں بڑھ سکا:

پارہ نمبر 4، آیت نمبر 188، سورت ال عمران

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۱۸۸

آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں اور اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کئے ان پر ان کی تعریف کی جائے ان کے بارے میں آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ وہ عذاب سے چھوٹ گئے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ الفاظ میرے کانوں سے گزرتے اور میرے ماضی اور حال کے حالات میرے سامنے گھومنے لگتے، اگر مجھے کبھی کسی نے دھوکہ دیا، تو اس کے پیچھے جھوٹی تعریفیں ہی نظر آئیں، اور پروفیشنل لائف میں بہتر سے بہتر پراگرس کے لیے ہمیں یا اپنی کمپنی یا اپنے پراڈکٹس یا اپنی سروس کی خاطر خواہ تعریف کرنی یا کروانی پڑتی۔ میری زندگی کی فلاسفی کو بدلنے کے لیے یہ ایک آیت کافی تھی۔

میں اپنے آپ کو اسی دن سے مسلمان سمجھتا ہوں، اسلام کی روح کیا ہوتی ہے، اللہ کو یاد کیسے کیا جاتا ہے اس کے لیے رویا اور تڑپا کیسے جاتا ہے، میری ذات اس طرح کی کسی بھی کیفیت سے سطحی طور پر بھی ناواقف تھی۔

قران پڑھیئے، دنیا میں ہماری ذات کو جھنجوڑنے کے لیے اس سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اتاری گئی اسی لئے اسے مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے۔

:ایک اور جگہ اللہ فرماتا ہے

:کیا تمہیں پوری زندگی میں اتنا وقت نہیں ملا تھا، کہ ایک دفعہ قران پڑھ لیتے

دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو قران پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے، اور اپنی ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رہنے کی طاقت بھی دے، امین۔

مصنف : میاں وقارالاسلام

تصنیف : بیسٹ لائف نوٹس

قرانِ مجید کا بہترین شاہکار

تحریر : میاں وقارالاسلام

میری ناقص عقل جس چیز کو قرانِ مجید کا بہترین شاہکار سمجھنے پر آمادہ ہے, میں اسے دوستوں سے ضرور شئیر کرنا چاہوں گا

قرانِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر طرح طرح کے مناظرے کئے ہیں، خاص طور پر جب محشر کے دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کرکے میدانِ محشر کر طرف لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قران میں ہر جماعت کے معاملات بیان کئے ہیں، ان جماعتوں میں ایک گناہ گار جماعت شامل ہے جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، ایک دوسری جماعت جو پرہزگاروں کی ہو گی جن کے چہرے روشن ہوں گے اور ایک تیسری جماعت جو سب سے آگے بڑھ جانے والی جماعت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان جماعتوں کے آپس میں بحث و تکرار کو بھی قلم بند کیا ہے۔ یہ بحث و مباحثہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

اور جب وہ دوزخ کو اپنے سامنے دیکھ لیں گے اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ اس میں ڈالے جانے والے ہیں تو ہر گناہ گار جماعت طرح طرح کے عذر پیش کرے گی تاکہ کسی نہ کسی طرح دوزخ کے عذاب سے بچ جائے۔ ایک جماعت کہے گی کہ یا اللہ یہ ہمارے بڑے، ہمارے عالم، ہمارے حکمران، ہمارے آباؤاجداد، دوست احباب خواہ کوئی بھی جماعت جس نے ان کو بہکایا ہوگا وہ اس کے بارے میں کہیں گے کہ انہیں دوگنا عذاب دیا جائے کیوں کہ انہوں نے ان کی زندگی اور آخرت تباہ کر دی۔ اللہ فرمائے گا کہ ان کو بھی دگنا عذاب اور تم کو بھی دگنا عذاب تم عقل نہیں رکھتے تھے۔ یوں ہر جماعت اس طرح کے عذر قبول نہیں کئے جائیں گے۔

ایک اور جماعت کہے گی کہ یا اللہ ہم سے ہماری زمینیں، جائیدادیں، جاگیریں، سونا و چاندی، کاروبار، بال، بچے اور اہل خانہ خواہ جو کچھ بھی ان کی ملکیت ہو وہ سب لے لیا جائے اور کسی طرح ان کی جان بخشی کر دی جائے۔ اس دن صرف اعمال کے سودے ہوں گے اور کسی سے ان کی ملکیت کا کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ ایک اور جماعت یہ کہے گی کہ یا اللہ اگر ہمیں دوبارہ دنیا میں جانا نصیب ہو تو ہم بھی نیک اعمال کریں اور گمراہوں میں نہ ہوں۔ تو ان کی یہ درخواست بھی رد کر دی جائے گی۔ ایک اور جماعت یہ کہے گی کہ یا اللہ ہمیں تو شیطان نے گمراہ کر دیا تھا، تو شیطان جواب دے گا کہ یا اللہ مجھ میں طاقت نہ تھی کہ ان سے کوئی گناہ کروا سکتا میں انہیں دور سے بلاتا تھا اور یہ خود ہی دوڑے چلے آتے تھے۔ تو اس جماعت کا یہ عذر بھی جاتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہر گناہ گار جماعت کے ہر طرح کے عذر ان کو واپس کر دیے جائیں گے اور گناہ گار انسان یا جماعت کے ہاتھ میں صرف مایوسی اور بے بسی ہی رہ جائے گی۔

اب گناہ گار انسان یا جماعت کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اب سارے عذر ختم ہو گئے ہیں اور بچنے کی کوئی تدبیر باقی نہیں رہی اور اب اس کا ٹھکانہ صرف دوزخ ہے۔ اور جب دوزخ کے داروغہ انہیں دوزخ کی طرف ہانکتے ہوئے لے جا رہے ہوں گے، اور ان کے چہروں پر رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا، اور ان کے دل اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے پھر ہم کلام ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس وقت تمہاری ذات جس قدر بیزار ہو رہی ہے کہ دوزخ میں ڈالی جائے گی، اللہ کی ذات اس سے کئی گناہ زیادہ بیزار ہوتی تھی جب تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کی راہ اختیار کیا کرتے تھے۔

مصنف و مرتب : میاں وقار الاسلام

تصنیف : بسٹ لائف نوٹس

وہی میں ہوں

تحریر: میاں وقارالاسلام

وہی میں ہوں کہ کمزور ہوں خطاوار ہوں گناہ گار ہوں راہ راست سے بھٹکا ہوا ہوں۔

وہی میں ہوں کہ اس کی نعمتوں سے مالا مال ہوں، کلمہ گو ہوں، مسلمان ہوں، اور وہ جب چاہتا ہے کچھ نہ کچھ اعمال زاد راہ کے طور پر مجھ سے کروا بھی لیتا ہے۔

وہی میں ہوں کہ جب بھٹکتا ہوں تو کئی کئی دن مسجد کا رخ نہیں کرتا، ذکر الٰہی سے بھی غافل ہو جاتا ہوں، نفلی عبادتیں تو دور کی فرض عبادتیں بھی جاتی رہتی ہیں۔

وہی میں ہوں جس پر وہ اپنا فضل کرتا ہے اسے اپنے گھر بلاتا ہے کئی عمروں کی سعادت نصیب کرتا ہے، غلاف کعبہ سے لپٹ کا رونا نصیب کرتا ہے حجرہ اسود کا بوسہ نصیب کرتا ہے اپنے گھر میں اعتکاف کے لیئے مہمان بھی کرتا ہے

وہی میں ہوں کہ جب اس کے گھر سے نکلتا ہوں تو آنکھیں پھیر لیتا ہوں، پاوں بھی ایسے موڑتا ہوں کہ ایک طرف میں اور ایک طرف راہ ہدایت۔

وہی میں ہوں جسے وہ اپنے محبوب کے روضے پر لے جاتا ہے، مسجد نبوی میں مہمان کرتا ہے اور مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات کی زیارت بھی نصیب کرتا ہے۔

وہی میں ہوں کہ اس کی نعمتوں سے مالا مال ہوتا چلا جاتا ہوں اور پھر وہی میں ہوں کہ اتنی نعمتیں حاصل کرنے کے بعد پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا ہوں۔

میں وہی ہوں جس پر اس کے رب کہ نعمتیں بارشوں کی طرح برستی رہتی ہیں اور جیسے ہی بارش رکتی ہے زمانے کی ہوا میرے جسم کو خشک کر دیتی ہے اور میرے بھٹکے ہوئے اعمال مجھے پھر سے جھلسانے لگتے ہیں

میں وہی ہوں جو قران پڑھتا ہوں اس کی ہر بات مجھ پر کھول دی جاتی ہے میرے لیے کیا اچھا ہے کیا برا ہے مجھ پر سب واضع کر دیا جاتا ہے

اور پھر وہی میں ہوں کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے انجان ہو جاتا ہوں جو تھوڑی بہت روشنی میرے دل میں اکھٹی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی میرے اعمال کی وجہ سے شب تاریک میں ڈھل جاتی ہے۔

وہی میں ہوں کہ نہ صرف اپنے دینی فرائض سے غافل ہوں بلکہ اپنے دنیاوی فرائض سے بھی غافل ہوں

وہی میں ہوں کہ اپنے ماں باپ کا فرمابردار بھی ہوں اور وہی میں ہوں کہ مجھے سے بہت سی نافرمانیاں بھی ہو جاتی ہیں۔

وہی میں ہوں کہ بہت سے معاملات میں بے غرض بھی ہوں اور وہی میں ہوں جس کی غرض بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

وہی میں ہوں کہ بڑی بڑی باتیں کرتا ہوں اور پھر وہی میں ہوں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی عمل نہیں کرتا۔

وہی میں ہوں کہ جو لوگ مجھے کم جانتے ہیں بڑھ بڑھ کر میری تعریفیں بھی کرتے ہیں اور پھر وہی میں ہوں کہ جو مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں میری ساری کوہتایاں جانتے ہیں اور آئینہ بھی دیکھا دیتے ہیں۔

وہی میں ہوں کہ اپنے اعمال کا احاطہ کروں تو مجھ میں وہ ساری چیزیں موجود ہیں جس سے میری پکڑ لازمی ہے۔

اور پھر وہی میں ہوں کہ تھوڑے اعمال ہتھیلی پر سجائے پھرتا ہوں اور یقین کیئے ہوئے ہوں کہ میرے کھوٹے سکے دربار الٰہی میں چل جائیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے سارے سکے کھوٹے ہیں پر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا رب ایسا بادشاہ کہ جس کے دربار میں جب فضل کی بارش ہوتی ہے تو کھوٹے سکے بھی چل جاتے ہیں۔

میں وہی ہوں جو جانتا ہے کہ اعمال کے سودے میں سوائے خسارے کے اور کچھ بھی نہیں میں وہی ہوں جو یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بڑے فضل کا مالک ہے۔

میں وہی کو جو بہت کمزور ہے، لاغر ہے، ناتوں ہے، نہ ارادے کا پختہ ہے نہ وعدے کا پختہ ہے، ہدایت پا لینے کے بعد بھی الٹے پاوں مڑ جاتا ہے پھر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے منہ کے بل گرتا رہتا ہے اور پھر اسی خاک ذدہ منہ سے توبہ کے لیئے پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔

میں وہی ہوں جو یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ جس نے مجھے توبہ کے لیئے کھڑا کیا ہے وہ ہر حال میں میری سننے والا ہے۔

تو میں اسی کو سناتا ہوں اور اسی سے مغفرت مانگتا ہوں نہ صرف اپنے لیئے بلکہ ان سب کے لیئے جنہیں میں اپنی دعاوں میں ہمیشہ یاد رکھتا ہوں جن سے میں کسی نہ کسی طرح منسلک ہوں چاہے وہ مجھ سے قریب ہیں یا دور چاہے جو مجھ میں ہیں یا پھر مجھے میں نہیں رہے۔

اس مہینے جس کا نام رمضان ہے بہت فضیلت والا ہے اور اس کی آخری دس راتیں خاص طور پر طاق راتیں بہت اہم ہیں اور سب سے اہم ہے وہ رات جسے اس نے ہزار مہینوں سے افضل کیا ہے۔ اور جس کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔

امید کرتا ہوں کہ وہ اپنے علم سے ہم پر رحمت کرے گا اور ہمارے لیئے آسانیاں فرمائے گا اور ہماری بخشش فرمائے گا۔ آمین، دعا گو، میاں وقار الاسلام

حرم میں ختم القران

تحریر : میاں وقار الاسلام

کل مکہ میں ماہ رمضان کی 29 ویں رات بھی تھی اور الواعی جمعہ مبارک بھی تھا اور اس کے ساتھ ہی ختم القران بھی تھا جس کے بعد خصوصی دعا کروائی گئی۔ خشک موسم تھا مگر آسمان میں بادلوں کی آمد بھی تھی۔

حرم میں روئے زمین پر یقینا مسلمانوں سب سے بڑی اور مقدس دعایا تقریب جاری تھی، لاکھوں لوگ کانپتے ہاتھوں، بھیگی آنکھوں، سسکیوں اور ہچکیوں سے اپنے رب کو راضی کرنے کو شش کر رہے تھے، ظاہر ہے میری کیفیت بھی ان سے الگ نہیں تھی، پہلی مرتبہ اتنے قریب سے اس طرح کا منظر دیکھنے کو ملا تھا، اسے یقینا لفظوں کا روپ نہیں دیا جاسکتا مگر مجھے بار بار قران کی دو آیات نظر آرہیں تھیں۔

اول یہ کہ اللہ قران میں فرماتا ہے کہ جنت میں انسان کوئی لغو بات نہیں سنیں گے اور ان کا آپس میں کلام ہو گا اسلام و علیکم

حرم میں لاکھوں لوگ موجود تھے مختلف رنگ و نسل کے اور ظاہری طور پر سب کا کلچر بھی جدا جدا تھا اور انداز بھی الگ الگ تھے سب کا آپس میں زیادہ تر کلام بھی اسلام و علیکم تھا اور یقینا کوئی آپس میں لغو بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ ایک ایسا روح پرور منظر تھا جو کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور جنت کے اس خوبصورت نظارے کی منظر کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے جس کا ذکر اللہ نے قران پاک میں کیا ہے۔ یقینا اللہ قادر ہے جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔ جو چاہتا ہے دیکھاتا ہے۔

ایک اور آیت کا مفہوم ہے کہ روئے زمین پر تمام لوگوں کی آنکھیں مل کر بھی تمہارے رب کا تدارک یا احاطہ نہیں کر سکتیں میں تمہار رب ہر آنکھ کا تدارک یا احاطہ کر سکتا ہے۔

حرم میں لاکھوں آنکھوں عشق الٰہی میں ڈوبی اپنے رب کی نظر کرم کی منتظر تھیں یقینا ہم اپنی آنکھ سے اپنے رب کو دیکھ تو نہیں سکتے مگر اپنی کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے سنتا ہے یقینا اس نے تمام آنکھوں کا احاطہ کیا ہوا ہے اور ہر دل کی کیفیت کو باخوبی جانتا ہے۔

اللہ کی شان بہت بلند ہے، حرم کی طرح پوری دنیا میں چھوٹی بڑی دعایا محفلیں ہوتی رہتی ہیں یا لوگ اکیلے بیٹھ کر بھی رب کی یاد میں گم ہوتے ہیں اور اسے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں یقینا اللہ دیکھتا ہے سنتا ہے اور ہر آنکھ کا تدارک یا احاطہ کیئے ہوئے ہیں۔

اگر 29 روزے ہوئے تو کل تک سب سے رابطہ بحال ہو گا۔ سب کے لیئے بہت سی دعائیں اور نیک خواہشات، اللہ ہم سب پر اپنا فضل و کرم قائم رکھے، زندگی کا امتحان اور آخرت کا سفر ہم پر آسان کرے اور ہمیں ہمیشہ رہنے والی کامیابی عطا کرے۔ امین

ابلیس نے ٹھیک کہا تھا

تحریر: میاں وقارالاسلام

ابلیس نے ٹھیک کہا تھا تیرے بندوں پر میرا زور نہیں چلے گا۔ یقینا ابلیس کی اوقات ہی نہیں کہ اللہ کے بندوں پر اپنا زور چلا سکے۔

مانا کہ حج اور عمرہ صرف انہیں کے لیئے ہے صاحب حیثیت ہے اور حرم تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مگر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو بے حیثیت لوگ با حیثیت ہو جاتے ہیں اور جنہیں طاقت نہیں ہوتی انہیں طاقت دے دی جاتی ہے، غریب، بوڑھے، لاچار، کمزور لوگ دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں حرم پہنچ جاتے ہیں اور یہ سلسلہ سارا سال رات دن جاری رہتا ہے۔

یقینا شیطان اپنی بے بسی پہ روتا ہوگا کہ جن لوگوں کو اس نے ساری زندگی اپنی ابلیسی زنجیروں سے جکڑے رکھا انہیں جب بھی اللہ کا حکم ہوا کسی نے بھی ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں کی اور اللہ کے گھر پہنچ گئے۔

لاکھوں پروانے دل میں محبت الہی کی شمع چلائے نور ربانی کے دربار میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ جب جماعت کھڑی ہوتی ہے حرم میں قدم رکھنے کی بھی جگہ نہیں بچتی تقریبا ہر جگہ سجدوں کے لیئے مخصوص ہو چکی ہوتی ہے پھر بھی ہزاروں لوگ بچ جاتے ہیں اور حرم سے باہر سڑکوں میں گلیوں میں پارکنگ میں جہاں اور جیسے کی بنیاد پر ماتھا ٹیک دیتے ہیں، مردوں اور عورتوں دونوں کے حالات ایسے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ظاہری کشمکش سے زیادہ لوگوں کی روحانی حالت اور دل کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

یقینا شیطان تو ایسے حالات میں الٹی چارپائی پہ سوتا ہوگا۔

سوتا بھی ہوگا کہ نہیں۔

اللہ کی شان بہت بلند ہے، اللہ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے، دنیا کے سب سے گناہگار بندے کو بھی چن لے تو ایک سیکنڈ سے پہلے اس کا دل پھیر دے اور شیطان دیکھتا ہی رہ جائے۔

حرم کے رقعت آمیز لمحات دیکھ کر یقینا شیطان سر پیٹتا ہو گا، کہ کاش وہ انسان کو ایک سجدہ کر دیتا تو روز روز کی ذلالت سے تو بچ جاتا۔

مگر اللہ نے جس کے ساتھ ذلالت چپکا دی سو چپکا دی

شیطان کے ساتھیوں کو سوائے ذلت کو اور کچھ نہیں ملتا دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں شیاطین کے حربوں سے بچائے رکھے اور ہمیں اپنے عزت والے اور مقرب بندوں میں شامل کر لے۔

آمین

دنیائے حرم

تحریر : میاں وقارالاسلام

حرم اپنے آپ میں ایک پوری دنیا ہے۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کے پورنور چہرے ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں قدم رکھتے ہی انسان یہاں کا ہو جاتا ہے۔ چند دنوں میں ایسے لگتا ہے کہ کہ ہم اسی دنیا کے باسی ہیں اور یہی دنیا ہماری پہچان ہے۔ تمام حوالے مدھم ہونے لگتے ہیں، اور ذہن میں نئی کائنات جنم لیتی ہے، روح ہر وقت عالم طواف میں ہوتی ہے سر سجود میں نظر آتے ہیں جسم مسجود معلوم ہوتا ہے۔ جسم کا پور پور ٹوٹ کر وجود کے اندر ایک نیا سنگم بناتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دل نے ابھی جنم لیا ہے اور نئے نئے احساس اور جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دھڑکنوں کا ڈھنگ بدل جاتا ہے، سانسوں کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ کلمہ حق پہلی مرتبہ دل سے ادا ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ بے وقعت ذرہ خود کو بڑا قیمتی محسوس کرنے لگتا ہے جیسے اس کو بارگاہ الٰہی نے چن لیا ہو اور ذرہ خواہش کرتا ہے کہ اے کاش اسے یہیں کہیں چن دیا جائے تاکہ جو رشتہ اللہ کے ساتھ جڑا ہے وہ جڑا ہی رہ جائے۔ اعتکاف کے 5 دن مکمل ہو گئے ہیں میں ابھی سے پریشان ہوں کہ رب کے در کو چھوڑا کیسے جائے۔ میری جبیں جس در پر جھک کر ساتویں آسمان پر پہنچ گئی ہے وہ زمیں پہ واپس کیسے آئے گی۔ دنیائے حرم کا مہمان جو خود کو یہاں کا باسی تصور کرنے لگا تھا اب وہ واپس اپنی دنیا میں کیسے جائے گا۔ یقیناً یہ معاملہ کسی بھی دل کے لیئے آسان نہیں ہوتا۔

تجلّیوں کی چوکھٹ سے اندھیروں کی طرف واپسی کا سفر بڑا ہی کٹھن ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ آپ سے آپ کی ساری کائنات چھننے والی ہے، پھر سے آپ کی روایتی پہچان آپ کو واپس ملنے والی ہے۔ مان اور مرتبہ آپ سے واپس لے لیا جائے گا۔ آپ سارے اختیار ختم ہو جائیں گے۔ اللہ کے گھر آنے کی جو حسرت آپ کے دل میں تھی، پھر سے وہی حسرت رہ جائے گی، مگر اب کی بار اس حسرت کی شدت کئی گناہ بڑھ چکی ہو گی۔ لوگ حرم سے ہو کر تو چلے جاتے ہیں مگر ایک عجیب سی تڑپ آپ کی روح میں اتر چکی ہوتی ہے۔ جب میز بان خدا کی ذات ہو تو وہ آپ کو اپنے گھر سے خالی ہاتھ کیسے جانے دے گی۔ دوبارہ آنے تڑپ وہ قیمتی تحفہ ہے جو آپ کو اللہ کے گھر جا کر نصیب ہوتا ہے۔ اور یہ عمدہ مہمان نوازی کا کھلا ثبوت ہے۔

دنیائے حرم کو سلام ہے، حرم اس زمین کا ایسا روشن ٹکڑا ہے جو کہیں اور دیکھنے کو نہیں مل سکتا۔ دنیائے حرم اللہ کی تجلّیوں سے آباد ہے اور یہ نور ایسا ہے کہ روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔ جن آنکھوں نے ہمیشہ اندھیرا ہی دیکھا ہو وہ یہاں آتے ہی چندھیا سی جاتی ہیں، دیر سے ہوش آتا ہے کہ گناہ گار بندے کے ساتھ معاملہ کیا پیش آیا۔

اعتکاف کا سفر جاری ہے آپ سب کے لیئے دعاوں کا سفر بھی جاری ہے اللہ آپ سب کو اپنی آمان میں رکھے، اعتکاف کے بعد سب سے رابطہ ہو گا۔

خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں سحری وافطاری کا نظام وانتظام

تحریر : میاں وقارالاسلام

آج کل کے دور میں جہاں ہمیں ساری برائیاں ہی مسلمانوں میں نظر آتی ہیں وہاں کچھ ایسی روایتیں ابھی تک پوری آب و تاب سے زندہ ہیں جس سے انسانیت کی خدمت بھی ہوتی ہے اور ثواب کا حصول بھی۔

جیسے ہی ماہِ رمضان شروع ہوتا ہے خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کی رونقیں آسمان کو چھونے لگتی ہیں۔ دنیا بھر سے لوگ عمرہ اور اعتکاف کی نیت سے خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کا رُخ کرتے ہیں۔

جس جوش اور جزبے سے لوگ یہاں پہنچتے ہیں اس سے کہیں زیادہ جذبے سے یہاں کے لوگ ان کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مہمان نوازی کا حق ادا کرے۔ مہمان نوازی صرف خانہ کعبہ اور مسجد نبوی تک محدود نہیں ہوتی بلکہ پورے سعودی عرب میں یہ سلسلہ اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔

خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں اس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، باقاعدہ گروپس بنتے ہیں کئی کئی لوگوں کو ملازمت پر رکھا جاتا ہے جن کا کام صرف سحری اور افطار کا خاطر خواہ بندوبست کرنا ہوتا ہے۔ اکثر مقامی لوگ رمضان کے آخری دس یا پندرہ دنوں کی چھٹیاں لے لیتے ہیں اور خانہ کعبہ میں یا پھر مسجد نبوی میں جا کر اپنی ٹیم کے ساتھ سحری اور افطاری کا انتظام کرتے ہیں۔

درستر خوان لگ جاتے ہیں، سب کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے مہمان بنے اور انہیں خدمت کا موقع دیں۔ پوری دنیا سے مسلمان ان لوگوں کے جوش اور جذبے سے متاثر ہو کر جاتے ہیں۔ اور انتہائی خوبصورت یادیں ان کے سفر کا حصہ بنتی ہیں۔

جو لوگ صاحبِ توفیق ہوتے ہیں باقاعدہ اس کارِ خیر کے حصہ دار بن جاتے ہیں اور پوری دنیا سے اس نیک کام کے لیے لوگ اپنا اپنا حصہ ڈالتے رہتے ہیں اور انتظامی معاملات بہتر سے بہتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پوری دنیا سے ہزاروں لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں سحری اور افطار کا انتظام میں اپنا باقاعدہ حصہ ڈالتے ہیں اور مقامی لوگوں کا پہلے سے ہی اس میں اپنا حصہ ہوتا ہے جو باہر سے آنے والے فنڈز سے اور مستحکم ہو جاتا ہے اور وہ اسے باخوبی سر انجام دیتے ہیں۔

حال ہی میں میرا کچھ ایسے دوستوں سے رابطہ ہوا جنہوں نے اس سارے طریقہ کار کی تفصیل شئیر کیں۔

مسلمانوں میں اچھی روایتں کم ہوتی جارہیں، انہیں زیادہ سے زیادہ پروان چڑھنا چاہیے اللہ تعالی ہمیں زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کا موقع دے امین

انسان باکمال خالق کی باکمال تخلیق

تحریر: میاں وقارالاسلام

میں نے برے سے برے انسان میں بھی کئی اچھائیاں دیکھی ہیں جو سطحی طور پر نظر نہیں آتیں اور میں نے اچھے سے اچھے انسان میں بھی برائیاں دیکھی ہیں جو سطحی طور پر نمایاں نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر بندے کو انمول بنایا ہے انسان اپنی محدود کمال آنکھوں سے اللہ کے بنائے ہے باکمال انسان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ انسان تو اپنے کمال کا احاطہ نہیں کر سکتا تو دوسروں کے کمال کا احاطہ کیسے کرے گا۔

پوری دنیا کے انسان مل کر بھی ایک انسان کا احاطہ نہیں کر پائے انسان کے جسم کے ایک ایک پور پر تحقیق جاری ہے اور روز روز ان کے کمالات سامنے آتے رہتے ہیں۔

اتنے نایاب حضرتِ انسان کو ہم بے وقعت و بے حرمت کیسے کر دیتے ہیں، انسان کے پورے وجود میں جو اس کا دل ہے اس کی اہمیت مرکزی ہے، دل کو وہ کمال حاصل ہے کہ وہ جسم کے جس حصے تک خون کی سپلائی بند کر دے وہ حصہ مردہ ہو جاتا ہے۔

اتنا طاقتور دل جس کے بھروسے پر انسان پوری زندگی گزار دیتا ہے، اس کی حقیقت دیکھی جائے تو اس کا ٹوٹنا ایک معمولی سے لمحے کی بات ہے، ایک چھوٹا سا جھٹکا اور بس اس کی ساری طاقت ختم، ہر دل اللہ کے حکم سے ڈھرکتا ہے، جس دن حکم ختم اس دن دل کی دھڑکن بند۔

ہمارے لہجے اور رویے دلوں کی رفتار کو بدل دیتے ہیں، اور ہماری وجہ سے اللہ کی ایک باکمال تخلیق لرزش میں آ جاتی ہے۔ اور ہماری زبان کو یہ کمال حاصل ہے کہ ہم میٹھے بول سے مردوہ دلوں کو زندہ کر سکتے ہیں اور زندہ دلوں کو مردہ بھی کر سکتے ہیں۔

خدا کرے کہ ہمارا معاشرہ محبتوں کا معاشرہ بنے جہاں ایک دل سے دوسرے دل تک محبت کا راستہ تو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر نفرت کا نہیں

ہائے قوم

تحریر : میاں وقارالاسلام

ہائے قوم یہاں کوڑا پھینکنا منع ہے، مطلب یہاں کوڑا پھینکنا ہے۔ ہائے قوم یہاں ہارن بجانا منع ہے، مطلب یہاں ہارن بجانا ہے۔

ہائے قوم یہاں سیاسی گفتگو منع ہے، مطلب یہاں سیاسی گفتگو کرنی ہے۔ ہائے قوم یہاں مسلک پر بات منع ہے، مطلب یہاں مسلک پر بات کرنی ہے۔

ہائے قوم یہاں سپیڈ کم کر لیں، مطلب یہاں سپیڈ بڑھانی ہے۔ ہائے قوم یہاں لائن بنانی ہے، مطلب یہاں لائن نہیں بنانی۔

ہائے قوم ملاوٹ ہماری پہچان مگر ملاوٹ والے ہم میں سے نہیں۔ ہائے قوم تمہیں ایک بتلانے والا آیا جس کے نام پر تم مرتے ہو اور اسی کی پیروی کرتے ہوئے تمہاری جان جاتی ہے۔

اللہ اس بات سے عار محسوس نہیں کرتا کہ مکھی مکڑی مچھر یا اس سے بھی حقیر چیز کی مثال دے کر انسان کو سمجھائے جیسا کہ اللہ تعالی نہ قران مجید میں بہت بار سمجھایا ہے، کیا واقعی ہم عقل نہیں رکھتے۔

ایک مثال بندر کی بھی ہے جس سے شرارت کے طور پر کوئی بھی حرکت کی جائے تو وہ فطری تور پر پلٹ کر ویسے ہی کرتا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ بندر بھی سمجھنے لگے ہیں اور ہو بہو ویسے ہی کرتے ہیں جیسا کہ انہیں سکھایا جاتا ہے۔

بندروں کے علاوہ بہت جانور ہیں جنہیں خوب سدھایا جاچکا ہے مگر افسوس قوم۔۔۔۔۔ ہم خود کو سکھانے میں کس قدر کامیاب رہے ہیں ہمیں سوچنا چاہیئے۔

ایک چیز ہوتی ہے سویک سینس، جس کا مطلب انسان کا ایک دوسرے انسان کے لیے اس قدر سینس رکھنا کہ اس کے کسی عمل سے دوسرے کو تکلیف نہ ہو

دوسرے انسان کی تکلیف کا احساس رکھنے کے بارے میں قران حدیث اور سنت میں جس قدر زور دیا گیا ہے اگر اسے ہم تھوڑا سا بھی سمجھ لیں تو ہمارا معاشرہ مثالی ہو جائے مگر افسوس دنیا انسان کے رہن سہن کے اس بنیادی اصول میں اتنا آگے جاچکی جتنا آگے شاید ہم دیکھ بھی نہیں سکتے۔

ہم کیسے کلمہ گو ہیں کہ ہمارے دل عام انسانوں کے احساس سے خالی ہیں۔ اسلام میں تو جانوروں اور درختوں کو بھی بلاوجہ نقصان یا تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں، دنیا میں جہاں انسان یہ سیکھ چکا ہے کہ دوسرے انسان کو تکلیف نہیں دینی وہاں ایک مسلمان کو کیا تکلیف ہے کہ اپنے مومن بھائی کے درپے ہے

ہم کس ذات اقدس کے نام لیوا ہیں اور کس کی تعلیمات کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اور دنیا کو کیا منظر پیش کرتے ہیں ہمیں ضرور سوچنا چاہیئے۔

دعا ہے کہ جب ہمیں حضور اکرم کا دیدار نصیب ہو تو ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ آمین، دعا گو میاں وقار الاسلام۔

مردہ پرستی

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہم بھی کتنے عجیب لوگ ہیں جب انسان مر جاتا ہے تو اس کی اچھائیاں ڈھونڈ کر اسے تعریف کے ساتھ یاد کرتے ہیں، اس کی کمی محسوس کرتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں ہمارے منہ سے ایسی بات نہ نکل جائے جس سے مردہ شخص کی دل آزاری ہو اور غلطی سے اگر کسی کے منہ سے کوئی غلط بات نکل جائے چاہے وہ سچی بھی ہو تو لوگ ہماری بات وہی روک دیتے ہیں اور ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ہم نے کتنی غلط بات کر دی اور ہم اس غلطی کو فوری طور پر غلطی تسلیم کرتے ہوئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہم کتنے عظیم لوگ ہیں، واہ کیا بات ہے ہماری۔ ہمارا رب ہم سے کتنا خوش ہوتا ہو گا کہ میرے بندے کمال ہیں۔

اب ذرا زندوں کا حال دیکھتے ہیں جن کی دل آزاری ہم اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگر لوگ باتوں سے مرتے ہوتے تو میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہمارے لہجوں کی وجہ سے مر جاتے، اور شاید کئی اسی وجہ سے مر بھی جاتے ہوں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہمیں مردوں کی کتنی فکر ہے جن کے بارے میں قران میں آتا ہے کہ یہ نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں سوائے شہیدوں کے جو زندہ ہیں اور اللہ کے ہاں سے انہیں رزق پہنچتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔ اور بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ مردے اسی طرح سنتے ہیں جیسے زندہ سنتے ہیں تو یہ معاملہ انہیں پر چھوڑ دیتے ہیں۔

مردے سنتے ہوں یا نہ سنتے ہیں، مگر زندہ لوگ تو سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور جو تکلیف ہمارے لفظوں اور لہجوں سے انہیں پہنچتی ہے اسے محسوس بھی کرتے ہیں۔

ہمیں چاہیئے کہ زندہ لوگوں کا کم سے کم اتنا ہی احترام کر لیں جتنا ہم مردہ لوگوں کا کرتے ہیں، یا پھر زندہ لوگوں کو اپنی عزت کروانے کے لیئے مر کر دیکھانا پڑے گا۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لوگوں کی مرنے کے بعد جو ہم ان کی تعریف کرتے ہیں اس میں یا تو کھلا احساس_ندامت ہوتا ہے یا پھر ہماری چھپی ہوئی منافقت ہوتی ہے۔

اگر احساس_ندامت ہے تو ہمیں چاہیئے کہ یہ ندامت ہم لوگوں کے جیتے جی اٹھالیں اور اپنی ذات کا بوجھ بھی ہلکا کریں اور اس زندہ شخص کا بوجھ بھی ہلکا کریں جس کے دل میں ہماری زبان کی کمان سے نکلے ہوئے تیز انداز الفاظ خنجر کی طرح گڑھے ہوئے ہیں۔ اور وہ اندر سے بری طرح گھائل ہے مگر بتا نہیں سکتا۔ ذرا سوچیں اگر اس کیفیت سے کوئی شخص اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو آخرت میں ہمیں کیسی ندامت اٹھانی پڑے گی

دوسری طرف اگر منافقت ہے تو منافقت ہی سہی کسی کا دل رکھنے کے لیئے جو ہم نے بعد میں اپنی جانوں کے ساتھ ڈرامے کرنے ہیں، وہ اس شخص کے جیتے جی ہی کر لیں تاکہ لوگوں کے انسانوں کے بارے ہیں یہ خیال کہ انسان بہت برے ہوتے ہیں، کچھ گمان تو بہتر ہوں، اندر سے ہم جیسے ہیں وہ تو ہمیں پتا ہی ہے، کم سے کم باہر سے ہم کچھ تو بہتر نظر آئیں۔

اندر کی انسانیت تو پتا نہیں کب کی مر گئی باہر کی انسانیت کو تو زندہ رہنے دیں، ہمارا معاشرہ محسوس کرنے میں انسانوں کا معاشرہ نہ لگے کم سے کم دیکھنے میں تو لگے۔

باقی کبیرہ گناہوں کی طرح لوگوں کی دل آزاری بھی کبیرہ گناہ ہے کاش ہم سمجھتے ہوتے اور اس بات کا احساس رکھتے

اللہ ہمیں ایک دوسرے کی دل آزاری سے بچائے، اور یہ توفیق دے کہ ہم مردہ لوگوں کی طرح زندہ لوگوں کا بھی احترام کریں۔ آمین

دعاگو، میاں وقارالاسلام

DOMINATE OR COMPROMISE

غلبہ یا سمجھوتہ

ڈومینیٹ یا کمپرومائیز

تحریر : میاں وقارالاسلام

شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں یکسر مختلف طرز زندگی کے عادی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لڑکی کا رجحان کھانے پکانے، سلائی کڑھائی کرنے کی طرف اگر زیادہ نہ بھی ہو تو تھوڑا بہت تو ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح شوخ رنگ پہننے اور میک اپ کا شوق بھی اپنی جگہ ہے۔ کچھ ماحول کا اثر سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارنے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح گھومنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا بات کرنا وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف لڑکوں کا اپنا ماحول ہوتا ہے، دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا زیادہ باہر رہنا یا پھر ہاسٹل لائف۔ اسی طرح ان کی شاپنگ بھی مختلف، پہننا، اوڑھنا، بچھونا بھی یکسر مختلف۔

لڑکیاں لڑکوں کی نسبت زیادہ آرگنائز ہوتی ہیں، زیادہ بن سنور کر بھی رہتی ہیں لڑکے ذرا کھلے ڈولے ماحول کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر عادی نہ بھی ہوں تو عادات کا فرق لڑکیوں میں اور لڑکوں میں خوب دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر یوں کہا جائے کہ لڑکا ایک گلیکسی سے آتا ہے اور لڑکی دوسری گلیکسی سے تو یہ بات بھی کچھ زیادہ غلط نہیں ہو گی۔

اب ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور دو مختلف قسم کے ماحول میں نشو نما پانے والے افراد ایک بندھن میں بندھنے کے بعد ایک چھت کے نیچے آ جاتے ہیں۔

اب لڑکا یہ چاہتا ہے کہ جس طرح کے ماحول میں وہ ڈھلا لڑکی بھی اسی ماحول میں ڈھل جائے اور لڑکی یہ چاہتی ہے کہ جس طرح کے ماحول میں وہ رہی لڑکا اس طرح کے ماحول میں ڈھل جائے۔ اگر دیکھا جائے تو فوری طور پر یہ تبدیلی ممکن نہیں ہوتی مگر پھر بھی تبدیلی آتی ہے۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ لڑکا ڈومینیٹ کر جائے اور لڑکی کمپرومائیز کر لے یا پھر لڑکی ڈومینیٹ کر جائے اور لڑکا کمپرومائیز کر لے۔ خیر جو بھی ڈومینیٹ کرے اس سے فرق نہیں پڑتا اور ایک خوبصورت سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اور دونوں میاں بیوی خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

سب کچھ ٹھیک ٹھیک چلتا رہتا ہے۔ ڈومینیٹ کرنے والا ڈومنیٹ کرتا رہتا ہے اور کمپرومائیز کرنے والا کمپرومائیز کرتا رہتا ہے۔ یہ دونوں ایک چھت کے نیچے اپنے اپنے رول کو ایڈجسٹ کر چکے ہوتے ہیں۔ جو ڈومینیٹ کر چکا ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور زندگی آئیڈیل ہے جبکہ کہ جو کمپرومائیز کر رہا ہوتا ہے وہ بھی اسے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر چکا ہوتا ہے۔

ڈومینیٹ کرنے والے کی زندگی تو جیسے شادی سے پہلے تھی شادی کے بعد بھی ویسی ہی رہتی ہے جب کہ کمپرومائیز کرنے والے کی زندگی میں کچھ تبدیلی نظر آنے لگی ہے تو وہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی جب اس کے دوست یا اس کی سہلیاں یا پھر ان کے ماں باپ یا بھائی بہن ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ہائے ہائے تم میں تو پہلے والی بات ہی نہیں رہی تو مسئلے یہاں سے شروع ہوتے ہیں۔

کمپرومائیز کرنے والا ڈومینیٹ تو کر نہیں سکتا مگر کمپرومائیز کرتا جاتا ہے اور پھر ایک پوائینٹ آتا ہے جب وہ پھٹ پڑتا ہے۔ اب ڈومنیٹ کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ کمپرومائیز کرنے والے کل تک تو ٹھیک تھا بلکہ لمبے عرصے سے ٹھیک تھا اور زندگی آئیڈیل تھی تو پھر اچانک کیا ہوا

بلی ایک دم سے شیرنی بن جاتی ہے یا پھر بلا ایک دم سے شیر بن جاتا ہے اور شکایات کی ایک لمبی لسٹ سامنے آنے لگتی ہے جو کبھی کسی کے تصور میں بھی نہیں ہوتی۔

ڈومینیٹ کرنے کی بجائے اپنے ساتھی کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا احترام کریں اسے وہی ماحول دیں جیسا ماحول اسے شادی سے پہلے دستیاب تھا یا پھر اس سے بھی بہتر۔ اپنے ساتھی کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں اگر وہ آپ کے لیے بدلے گا تو وہ اپنا آپ کھو دے گا۔ اس کی پرانی شناخت چلی

جائے گی اور وہ خود کو ڈھونڈتا رہے گا اس کی وہ تمام صلاحیات جنہیں کھل کر سامنے آنا تھا وہ دب جائیں گی۔ جس کے ساتھ آپ زندگی کی حقیقی خوشی دیکھنا چاہتے ہیں اگر وہ ہی حقیقی طور پر خوش نہ ہو تو جس خوشی کی آپ کو تلاش ہے وہ خوشی آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔

شادی سے پہلے کی زندگی ایک کلی کی صورت ہوتی ہے جو شادی کے بعد کھل کر گلاب ہو جاتی ہے اور اس کی خوشبو چاروں اطراف کو مہکا دیتی ہے۔ کلی کے مرجھانے سے اس کی وہ چاشنی جو اس کے اندر موجود ہوتی ہے وہ وہیں دم توڑ جاتی ہے اور پھر کسی طرح باہر نہیں آ پاتی۔ پھر چاہے وہ لڑکا ہو یا پھر لڑکی ایک ادھورا پن دونوں میں بنا رہتا ہے۔

اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا گلہ کبھی نہ دبائیں اگر آپ کو پینٹنگ کا شوق ہے، شاعری کا شوق ہے یا پھر کوئی بھی اور شوق ہے تو اس کا سودا کبھی مت کریں نہ اپنے لیئے نہ اپنے ساتھ کے لیئے۔ ہو سکتا ہے جو کام آپ کو فضول لگتا ہو وہ آپ کے ساتھی کی خوشی کا سبب ہو یا پھر جو آپ کا شوق ہے جسے آپ اپنی ساتھی کو خوش کرنے کے لیے چھوڑ رہے ہیں ہو سکتا ہے اس کے ساتھ آپ کی تسکین بھی چلی جائے۔ ایک دوسرے سے ایسی خواہش مت کریں جس سے آپ کو تو بہت آسانی ہو مگر اگلا مشکل میں پڑ جائے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی تعریف کر دینے میں شاید آپ کا تو کوئی نفع نقصان نہ ہو مگر یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کے ساتھی کے احساسات بہت زیادہ خوشگوار ہو جائیں۔

یاد رکھیں کہ خوشگوار ماحول کبھی یک طرفہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی ڈومینینسی کو بھی تقسیم کریں اور کمپرومائیز کو بھی تقسیم کریں اور معاملات کو برابری کی سطح پر لے آئیں آپ کے ماحول سے زیادہ خوشگوار ماحول کسی کا نہیں ہو گا۔

حیااور غیرت

تحریر: میاں وقارالاسلام

باحیا" ہونا عورت کا ہی دوسرا نام ہے۔ "بے حیا عورت" بے حیائی کی نمائندہ ہوتی ہے اسے عورت کی نمائندگی کا حق ہر گز نہیں ہونا چاہیئے"

غیرت مند" ہونا مرد کا ہی دوسرا نام ہے۔ "بے غیرت مرد" بے غیرتی کا نمائندہ ہوتا ہے اسے مرد کی نمائندگی کا حق ہر گز نہیں ہونا چاہیئے۔"

بے حیا عورت" اور "بے غیرت" مرد دونوں کی حیثیت دو ٹکے کی ہوتی ہے۔ انسان کو عزت اس کے کردار کی وجہ سے ملتی ہے اس کی جنس کی وجہ " سے نہیں۔

باکردار" عورت کی بھی معاشرے کے تمام فرد عزت کرتے ہیں اور "باکردار" مرد کی بھی معاشرے کے تمام فرد عزت کرتے ہیں۔"

بدکردار" عورت اور "بدکردار" مرد دونوں کو معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

دنیاوی ترقی بڑی ظالم چیز ہے یہ مرد کی آنکھ سے غیرت اور عورت کی آنکھ سے حیا چھین سکتی ہے اور کافی حد تک چھین بھی چکی ہے ایسی ترقی کا کیا فائدہ جس کا نقصان آخرت کی تباہی ہو۔

کچھ بے جان تحریکیں معاشرے میں بگاڑ کے لیئے پیدا ہوتی ہیں اور وقت کی قبر میں اپنے آپ دفن ہو جاتی ہیں۔ فلک شگاف نعرے زمین میں شگاف ڈھونڈ لیتے ہیں۔

طاقت یہ نہیں کے آپ اختیار رکھیں تو کمزور کو دبا دیں، بلکہ طاقت تو یہ ہے کہ آپ اختیار بھی رکھتے ہوں اور پھر کمزور کو معاف کر دیں بلکہ اسے اپنی طاقت میں سے حصہ دیں اور اسے بھی مضبوط کریں۔

نہ صرف امیر یا طاقتور مرد غریب اور کمزور عورتوں کا استحصال کرتے ہیں بلکہ امیر یا طاقتور عورتیں بھی غریب اور کمزور مردوں کا استحصال کرتی ہیں۔

جن معاشروں میں کمزور اور بے بس لوگوں کو انصاف نہیں ملتا ان معاشروں میں امن اور خوشحالی کبھی بھی داخل نہیں ہوتی کیوں کہ ظلم چاہے کسی بھی شکل میں ہو امن اور خوشحالی کا بڑا دشمن ہے۔

دو طرح کے طبقے ہیں ایک اتنے آزاد ہیں کہ ان کے مرد بھی آزاد ہیں اور ان کی عورتیں بھی آزاد ہیں اور دوسرے جن کی عورتیں بھی مجبور ہیں اور عورتیں بھی مجبور ہیں۔

اور ایک تیسرا طبقہ ہے جو باوجود آزاد ہونے کے اپنی حدود کا تحفظ کرتا ہے اور باوجود مجبور ہونے کے پھر بھی اپنی حدود کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں لوگوں کی عاقبت محفوظ ہے۔

صرف عورت ہی گھر سے نہیں بھاگتی، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مرد بھی گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے اسے جانور کی پنجرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ جتنا حق ہے اتنی آزادی ضروری ہے۔

میرے ایک استاد نے کہا تھا کہ "وقار" ہمارا ایمان تو دو فاقوں کی مار ہے تو ہمیں بڑے بڑے دعوے نہیں کرنے چاہیں بلکہ اللہ سے رحم مانگنا چاہیئے کہ وہ ہمیں کسی آزمائش میں نہ ڈالے۔

اللہ کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے لوگوں کے دن بدل سکتا ہے، جو کبھی شہزادے تھے یا شہزادیاں تھیں آج ان کے حالات فقیروں سے بھی برے ہیں اور جو کبھی در بدر کی ٹھوکریں کھاتے تھے آج صاحب اختیار ہیں۔

انسان کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ انسان بہت ہی کم شکر ادا کرتا ہے بہت سارے لوگ اسی ناشکری میں بہت کچھ گنوا بیٹھتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس کی قدر نہیں کرتے۔

اللہ نے جیسے عورت کے لیئے حد بندی کی ویسے ہی مرد کے لیئے حد بند کی ہے اور دونوں کو اپنی حدود میں رہنے کا حکم ہے۔ نہ مرد کو اجازت ہے کہ عورت پر غیر شرعی حدیں قائم کرے نہ عورت کو حق ہے کہ وہ مرد کے لیئے نئی حدیں مقرر کرے یہ مرد اور عورت کو راضی کرنے کی بات نہیں یہ اپنے رب کو راضی کرنے اور اس کا حکم ماننے کی بات ہے۔

مغرب نے عورت کو بہت زیادہ آزادی دی اور آزادی نے ان کا معاشرہ تباہ کر دیا اور اب یہ تباہی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے۔ مگر اسی تباہی میں اپنا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر بہت سی مغربی عورتیں اسلام میں اپنے لیئے جائے پناہ ڈھونڈتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے اسلام میں عورت کا مقام۔ قران کسی شیطان مردود کا کلام نہیں جسے کبھی بھی جھٹلایا جا سکتا ہے۔ یہ کلام الہی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے اور ہمیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے کاش ہم سمجھتے۔

اللہ تعالی تمہیں عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، برے کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں وعظ کرتا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔ [النحل: 90]

اور اس شخص سے کس کا دین بہتر ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہو، وہ نیکو کار بھی ہو اور یکسو ہو جانے والے ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کر رہا ہو۔ [النساء: 125]

بیوی کے عنوان سے سورہ روم، آیت 21 میں ارشاد پروردگار ہے: "وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ"، "اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت (نرم دلی و ہمدردی) پیدا کر دی۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں"۔

ماں کے عنوان سے سورہ احقاف، آیت 15 میں ارشاد الٰہی ہے: "وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا"، "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اس کی ماں نے زحمت کے ساتھ اسے پیٹ میں رکھا اور زحمت کے ساتھ اسے جنم دیا"۔

آپ ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ: جب تم حیا نہ کرو تو جو من میں آئے کرتے جاؤ، بخاری۔

یہ اللہ کے مقرر کیئے ہوئے اندازے ہیں اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا حساب ضرور ہو گا۔۔ چاہے وہ مرد ہوں یا پھر عورتیں اللہ سب کے ساتھ انصاف کرنے والا ہے اور وہ کسی بات سے لاعلم نہیں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ہمیں ہدایت دے اور ہم ہرگز ظالم لوگوں میں شامل نہ ہوں۔ آمین

چاہا ہم نے سورج کو بھی
چاند سے ہم نے الفت کی ہے

عکس خدا کا ہر ذرے میں
ذروں نے بھی عبادت کی ہے

حیا پروئی ہے نظروں میں
ہر انسان کی عزت کی ہے

اہل وفا سے دنیا بھر کے
ہر باسی نے شرارت کی ہے

سے پیار کیا ہے جس نے

اس نے سب سے محبت کی ہے

شاعر: میاں وقار الاسلام

تہذیب کا دائرہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

مہذب قومیں کی تہذیب انہیں یہ نہیں سکھاتی کہ ہر ظالم اور سرکش کی جی حضوری کی جائے، بلکہ مہذب قوموں کے باشعور افراد مظلوم کی آواز کو اُٹھاتے ہیں، ظلم کے خلاف لکھتے ہیں اور ایک عام آدمی کے درد سمجھتے ہیں اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ بے حس قوموں کی طرح سب اچھا ہے کا راگ نہیں الاپتے۔ نہ ہی مفلوج قوموں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ اللہ سب دیکھ رہا ہے اللہ خود ہی سب ٹھیک کر دے گا۔ ہم بات کریں گے تو کسی مصیبت میں آ جائیں گے۔ اور لوگ کیا کہیں گے۔ یہ ظالم پہلے والے سے کم ظالم ہے، یہ کرپٹ پہلے والے سے بہتر ہے۔ یعنی بڑا فرعون ہونا ظلم اور چھوٹا فرعون ہونا باعث رحمت، ایسے پڑھے لکھے جاہل اور مصلحت کے ذریعے ہر طرح کے مافیے کو سپیس دیتے دیتے پوری قوم کو اس آگ کی لپیٹ میں لے آتے ہیں۔

چور چھوٹا ہو یا بڑا چور چور ہوتا ہے اور اسے پکڑے جانے کا ڈر ہر وقت ہونا چاہیے، اگر عدالتیں نااہل ہوں چور کو یقین ہو کہ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا تو وہ کبھی چوری نہیں چھوڑے گا بلکہ چوری کرنے کے ایک سے ایک مہذب رستے ڈھونڈے گا۔ اور عوام ایک طرف تو پستی جائے گی اور دوسری طرف واہ واہ کرتی جائے گی۔

ایک عام آدمی حق پر بھی ہو تو بھی کرپٹ اداروں سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اس کی لپیٹ میں نہ آ جائے، ہمارے ملک میں واپڈا، پی ٹی سی ایل، پولیس، ٹیکسیشن ریلوے خواہ کوئی بھی محکمہ ہو ہمیں سارے افسر جلاد نظر آتے ہیں، اور ہم ہر جگہ ہی ان سے ڈر ڈر کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں واسطہ نہ پڑ جائے، حق پر چلنے والے ان افسروں سے ڈر ڈر کر گذرتے ہیں جب کہ چور اور لٹیرے ان کی اوقات سے واقف ہوتے ہیں کہ کس کی کتنی قیمت ہے اور جہاں سے چاہتے ہیں باآسانی گذر جاتے ہیں۔

اگر ہم نے یہ مہذب معاشرہ بنایا ہے تو مجھے افسوس ہے ایسی سوچ پر جو اسے مہذب معاشرہ کہتی ہے جس کے پور پور میں کرپشن کا کینسر بھرا ہوا ہے اور اس سے زیادہ افسوس مجھے ان پڑھے لکھے جوانوں پر ہے جن کی آنکھوں پر مصلحت کے پردے ہیں اور وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ ظلم کے خلاف بولنا غیر مہذب نہیں ہے بلکہ ظالم کے خلاف نہ بولنا غیر مہذب ہے۔

بے پردہ، باپردہ

تحریر: میاں وقارالاسلام

پردے کا تعلق جنس سے نہیں ہے بلکہ پردے کا تعلق انسان سے ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ پردہ صرف نقاب یا چلمن نہیں، دیکھنے، بولنے، لکھنے، سننے اور سوچنے کے انداز میں بھی پردہ ہوتا ہے۔ اسی لیے پردے کا حکم جتنا عورت کے لیے ہے اتنا ہی مرد کے لیے ہے۔

تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے نے ہر چیز کا پردہ اتار دیا ہے۔ ایک وقت تھا جب لڑکے بھی شرمیلے ہوا کرتے تھے، اب تو کوئی لڑکی بھی شرمیلی نہیں ملتی۔

ہوا کچھ یوں کہ پردے کو کمزوری سمجھا جانے لگا، جیسے جیسے میڈیا نے ترقی کی دیکھنے، سننے اور سوچنے کے انداز بدل گئے اور آہستہ آہستہ چلمن اور نقاب بھی دور پرانا ہوتا چلا گیا۔ جو چٹر چٹر باتیں نہ کرے اور پٹر پٹر جواب نہ دے وقت نے ایسے لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، خوشامد کرنے والے، باتوں میں سے بات نکالنے والوں کو سمارٹ سمجھا جانے لگا اور شریف اور سادہ لوگ مار کھانے لگے۔ لڑکیوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، نئے انداز کی ملبوسات نہ پہننے والی لڑکیوں کو معاشرے نے مایوس کر دیا اور ان کی جگہ ماڈرن لڑکیوں نے لینا شروع کر دی۔

بہت سے لوگوں نے وقت کی گستاخانہ اور بے باک تبدیلیوں کو نہیں اپنایا۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی رہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے لوگ بھی ویسے ہی رہے۔ بہت سے لڑکیاں اور خواتین ہیں جنہوں نے پردے کا خاص خیال رکھا، نہ صرف دیکھنے بولنے سننے اور سوچنے کے پردے کو بلکہ انہوں نے نقاب بھی پہنے، اوڑھنیاں بھی اوڑھیں اور اپنے آپ کے معاشرے میں کسی سے پیچھے بھی نہیں رہنے دیا۔ اسی طرح بہت سے مرد حضرات بھی ہیں جنہوں نے نہ صرف نظریں نیچی رکھیں، بلکہ بولنے، سننے، دیکھنے اور سوچنے کے انداز کو بھی وقت کے ساتھ تبدیل نہیں کیا اور اس کے باوجود بھی انہوں نے معاشرے میں وہ مقام پایا جو بہت سے بے باک مرد و حضرات نے نہیں پایا۔

ہمیں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے، کہ پردہ کمزوری نہیں ہے، اور بے پردگی طاقت نہیں ہے۔ انسان کی صلاحیتں اس کی بات کی محتاج نہیں کہ وہ بے پردگی سے اپنے آپ کو منوائیں، بہت سے خواتین ایسی ہیں جو باپردہ بھی ہیں اور بااعتماد بھی ہیں، اور بہت سے مرد بھی ایسے ہیں کہ نظریں نیچی رکھتے ہیں مگر ان کی خوداعتمادی عام لوگوں سے بہت بہتر ہے۔

معاشرے نے ہمیں بہت بگاڑا ہے، کیوں کہ ہم نے معاشرے کے رنگ کو پہن لیا ہے اور اسے قبول کر لیا ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں جو لوگ اس رنگ کو نہیں پہن رہے وہ بھی پہن لیں اور ہمارے جیسے ہی ہو جائیں، اگر سب ہمارے جیسے ہو جائیں تو کیا ہو جائے گا۔ یقیناً کچھ بھی نہیں ہو گا بلکہ معاشرہ اور بگڑے گا۔ کامیابی صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے میں ہے، کامیابی اس میں ہرگز نہیں کے ساری عورتوں کے چہرے بے پردہ ہو جائیں اور سارے مردوں کی آنکھیں بے پردہ ہو جائیں۔

نجی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو بھی ایسے لوگ کامیاب جو پردہ رکھتے ہیں، اور ایسے بہت سے لوگ ناکام ہیں جن کی بے باکی مثال ہوا کرتی تھی۔ اور پھر آخرت کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔

ہم پردہ کریں یا نہ کریں اس سے کسی کو شاید فرق پڑے یا نہ پڑے مگر ہمارے رویوں سے بہت سے لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ جو لوگ باپردہ رہنا چاہتے ہیں چاہے مرد ہوں یا عورتیں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کی دل آزاری کریں، انہیں نیچا دیکھایں اور ان کی حوصلہ شکنی کریں۔ بہت سے ادارے اسی لیے تباہ ہو جاتے ہیں جو لوگوں کی بے باکی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور لوگوں کی صلاحیتوں کو نظرانداز کرتے چلے جاتے ہیں۔

چاہیے تو یہ کہ جتنی حوصلہ افزائی بے باک لوگوں کیا کی جاتی ہے کم از کم اتنی ہی حوصلہ افزائی باصلاحیت لوگوں کی بھی کر دی جائے۔ مگر میرا انہیں خیال کے لوگ اپنی روش کو بدلنا چاہیں گے یا بدل سکیں گے۔ کیوں کہ یہ نصیب کی بات ہے، جو لوگ کمزور راستوں پر چلنا چاہتے ہیں، انہیں دور سے مضبوط راستوں کی طرف بلایا تو جا سکتا ہے مگر کھینچ کر لایا نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ یہ ہدایت کا معاملہ ہے سو اللہ جسے چاہے اسے ہدایت دے۔ اور جو ہدایت ہی نہیں چاہتا اسے ہدایت مل بھی کیسے سکتی ہے۔

اے اللہ ہم اندر سے بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ دنیا نے ہم پر جو رنگ چڑھا دیا ہے وہ بہت برا ہے۔ ہم نے تو اس رنگ کو پہنچا تھا جو ہماری طرف بھیجا گیا، مگر ہم نے وہی غلطیاں کی جو ہم سے پہلے اُمتوں نے کیں اور ہمارا بھی انہیں جیسا حال ہے۔ اے اللہ ہم پر رحم فرما، ہم جو آگ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اسے نہیں جانتے اور شاید ہمارے جاننے سے پہلے ہماری زندگیاں ختم ہو جائیں۔ اور جو ہم زادِ راہ اکھٹا کر رہے ہیں وہ یقیناً بہت برا ہے۔

ہماری آنکھیں وقت کی روشنیوں میں چندھیا گئی ہیں۔ سلام ہے ایسے لوگوں پر جو اس کر تیز روشنیوں میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بہت سے لوگوں سے بہت الگ ہیں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ ہمیں دنیا اور آخرت کی نہ نظر آنے والی آگ سے بچائے، آمین، میاں وقار الاسلام

ایک مچھلی

تحریر : میاں وقارالاسلام

کہتے ہیں کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے، کچھ مرد سارے مردوں کو بدنام کر رہے ہیں اور کچھ عورتیں ساری عورتوں کو بدنام کر رہی ہیں تالاب خالی کرنے کی بجائے گندی مچھلی کو نکالنا چاہیئے۔

جو عورتیں اپنے فرائض سے آشنا نہیں اور صرف اپنے آشناؤں کے ساتھ تعلق رکھنا چاہتی ہیں جو کہ بے حیائی کا کام ہے۔ تمام عورتوں کو ان کے خلاف کھڑا ہونا چاہیئے، جس طرح سے وہ کھڑی ہوئی ہیں۔ جو عورتیں اپنے فرائض سے آشنا ہیں تمام مردوں کو ان کے حقوق کے لیے ساتھ کھڑا ہونا چاہیئے یہی انسانیت ہے۔

خاندان مردوں اور عورتوں کو ملا کر بنتے ہیں رشتوں کے بندھن سے آزاد نہ مرد کی کوئی عزت ہوتی ہے اور نہ ہی عورت کی کوئی عزت ہوتی ہے۔ مرد کے پاس ماں، بہن، بیوی اور بیٹی سے قیمتی اثاثہ اور کوئی نہیں ہوتا اور نہ ہی عورت کے پاس باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے سے زیادہ کوئی قیمتی اثاثہ ہو سکتا ہے۔

میں نے ایک بھی عورت کی پوسٹ نہیں پڑھی جس نے "میرا جسم میری مرضی" کی حمایت کی ہو سوائے چند رنگ برنگی تخریب کار آنٹیوں کے، مگر کچھ لوگوں کو خواہ مخواہ ماروی سرمد کا بھائی بننے کا شوق ہے۔ جس عورت کا حیا سے واسطہ ہے اس کا ماروی سرمد سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔

جس طرح سے عورتیں ماروی سرمد کے خلاف اٹھی ہیں اور اپنی اقدار کی محافظ بنی ہیں انہیں سلام ہے میرا تو دل نہیں کرتا کہ ماروی سرمد کے نام کے ساتھ عورت بھی لگاؤں یہ کوئی اور ہی بلا ہے۔

ماروی سرمد کی حرکتیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، اس عورت کا نہ کوئی دین ہے نہ ایمان، اس کا عورت کے نام سے منسوب کوئی ایجنڈا نہیں، اس کے منہ سے جب بھی کچھ سنا ہے سوائے خرافات کے کچھ نہیں سنا۔ ایک باحیااور باکردار عورت ماروی سرمد جیسی ایک ہزار بے حیااور بدکردار عورتوں پر اکیلی ہی بھاری ہے۔

بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا، ماروی سرمد کا صرف اتنا ہی نام کہ وہ بدنام ہے۔ ماروی سرمد کا نشانہ مرد نہیں بلکہ باحیا عورتیں ہیں۔ ماروی سرمد بے حیا عورتیں کی نمائندگی کرتی ہے ہر باحیا عورت سمجھ دار ہے۔

ہم نے مار بھی کھائی ہے ہم زخمی بھی ہوئے ہیں ہم نے قربانیاں بھی دی ہیں اور ہم پوری قوت سے اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے ہیں، لاکھ اختلافات کے باوجود ہمیں کوئی تقسیم نہیں کر سکتا، مگر کوشش میں بہت سے لوگ ہیں۔

جو عورت ہمیشہ پاکستان اور نظریہ پاکستان کے خلاف رہی، پاک فوج اور اسلام کے خلاف رہی، قائد اعظم رح اور علامہ اقبال رح کے خلاف رہی، آج تمام لعنت کرنے والے اس پر لعنت کرتے ہیں۔ ماروی سرمد کو جس طرح کی آزادی چاہیئے، وہ ہیرا منڈی کی عورتوں کو وافر مقدار میں حاصل ہے، تاریخ گواہ رہی ہے کہ اس طرح کی عورت سے عورت بھی شرمسار ہوئی ہے۔

ماروی سرمد کہتی ہے کہ اس کی بے عزتی ہو گئی ہے، جس عورت نے کبھی کوئی عزت والا کام نہ کیا ہو اس کی بے عزت کیسے ہو سکتی ہے جتنا یہ گند پھیلاتی رہی ہے وہ آج سود سمیت اس کے سامنے ہے۔ پاکستان میں بہت سی این جی اوز کو بند کر دیا گیا جو ملکی مفاد کے خلاف کام کر رہی تھیں ان کا کام بھی ماروی سرمد کی طرح خرافات پھیلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اچھی بات یہ ہے کہ دو ٹکے کی عورت کو ٹکے کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، ماروی سرمد کو ہمیشہ سے لعنتوں کے حصول کی خواہش رہی اور وہی اسے ملیں اور اسی کے اسے پیسے ملتے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ میرا ملک اتنا کمزور نہیں کہ دو ٹکے تخریب کار عورتیں یہاں اپنے گھناؤنے عزائم میں تھوڑی سی بھی کامیاب ہو سکیں۔ جو عزت چاہتا ہے اللہ اسے عزت دیتا ہے اور جو ذلت چاہتا ہے اللہ اسے ذلت دیتا ہے ہمیشہ یہ بات 100 فیصد سچ رہی ہے۔

مگر ہمیں تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، جس کی وجہ سے ماری سرمد جیسی عورتوں کو مزید ریتا پھیلانے کی وجوہات ملتی ہیں۔ایسے مردوں کا احاطہ بھی ضروری ہے جو عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرتے ہیں۔اور ایسی عورتوں کا احاطہ بھی بہت ضروری ہے جن کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جن کی وجہ سے عورتیں مزید محرومی میں چلی جاتی ہیں۔

ہم اسلام کے علمبردار تو بہت بنتے ہیں مگر ہم اسلام کی بنیادوں کو ہلانے میں خود بھی مصروف نظر آتے ہیں۔اللہ کسی کمزور پر ظلم کی اجازت نہیں دیتا اور نہ کی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جائے۔اور جو لوگ ظالم ہیں وہ اللہ کے گرفت سے باہر نہیں، اگر اللہ انہیں مہلت دے سکتا ہے تو کبھی بھی ان کی پکڑ بھی کر سکتا ہے۔ظالموں کی اپنی پکڑ سے ڈرنا چاہیے اور اس انجام سے بھی ڈرنا چاہیے تو اللہ کے ہاں تیار ہے۔اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔

مرد اور عورت دونوں انسان ہیں، دونوں کو ہی ایسے کام کرنے چاہیں جس سے انسانیت شرمندہ نہ ہو۔دعا گو، میاں وقار الاسلام

غیر مہذب رویئے غیر مہذب قومیں

تحریر: میاں وقارالاسلام

اللہ تعالی نے بدلہ لینے کی یا پھر حملہ کرنے کی جبلی صفات ہر چرند اور پرند وغیرہ میں رکھی ہیں۔ سانپ ڈس لیے گا، کتا کاٹ لے گا، گینڈ ٹکر مارے گا، گدھا دولتی مارے گا، بارہ سنگا سینگھ مارے گا، اسی طرح دیگر چرند پرند اپنے اپنے انداز میں چھپٹتے پلٹتے دیکھے جا سکتے ہیں۔

انسان کی حالت بھی ان سے سے کچھ مختلف نہیں، مولوی فتوہ دے دے گا، وکیل کیس کر دے گا، فوجی بندوق کا استعمال کرتے گا، صحافی زبان اور قلم کا استعمال کرے گا اور ارباب اختیار اپنے اپنے اختیار کا استعامل کریں گے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے مگر انسانوں کو بہت سے جبلی تقاضے حیوانوں کی طرح پورے کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے، جیسے انسان کاٹ بھی لیتے ہیں، پاوں اور ہاتھ کا استعمال بھی کرتے ہیں اور سب سے زیادہ جبلی تقاضہ زبان سے برے کلمات ادا کر کے یا پھر جوتا مر کر یا پھر سیاہی پھینک کر یا پھر کسی کی عزت تار تار کر کے اپنے جبلی تقاضوں کی تسکین کی جاتی ہے۔

جن معاشروں پر کبھی مہذب ہونے کا ٹیگ نہیں لگا ہوتا ہو اسے بھی اپنی تہذیب کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں اور طوفانِ بد تمیزی کو اپنے شعار کا حصہ بناتے دیر نہیں لگاتے۔ پھر ہر پلیٹ فارم چند ہی لمحوں میں مچھلی منڈی کا منظر پیش کرنے لگتا ہے اور جب سارا معاشرہ بد تہذیبی کے سمندر میں نہا نہیں لیتا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ایک طرف لوگوں کی جبلی تسکین پوری ہوتی چلی جاتی ہے ور دوسری طرف ایک اور جماعت نئے نئے آئیڈیاز کو جنم دینے میں لگی رہتی ہے۔

افسوس کا مقام تب آتا ہے جب اس مسئلے کو مسئلہ نہیں بلکہ مسائل کا حل سمجھنا شروع کر دیا جاتا ہے جس سے اس طرح کے دیگر عناصر تقویت پاتے ہیں اور اور پھر برائی کو اچھائی کے ساتھ مکس کر کے پروان چڑھایا جانے لگتا ہے۔

تہذیب کی بنیادی اکائیوں کا جنازہ نکل جاتا ہے، پڑھے لکھے افراد جنہیں معاشرے میں مثبت تبدلی لانی چاہیے تھی وہ بھی اس کارِ خیر میں آگے آگے ہوتے ہیں اور جنھوں نے کبھی سکول، کالج اور یونیورسٹی کا منہ ہی نہیں دیکھا ہوتا ان میں اور پڑھے لکھے افراد میں فرق نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ جاہل اور عالم ایک جیسے راگ الاپتے نظر آتے ہیں گویا محمود و ایاز کر فرق کچھ یوں ختم کر دیا جاتا ہے۔

اسلام ہمیں واضح طور پر تمسخر اُڑانے سے روکتا ہے، مگر کچھ لوگوں کے عقیدوں میں پین دی سری سرائیت کر جاتی ہے اور وہ اپنی جہالت کے اندھیروں کو اسلام کا نور بنا کر پیش کرتے ہیں جبکہ کہ نہ اسلام کبھی ایسا تھا اور نہ ہی اسلام کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا شمار مہذب قوموں میں ہو تو ہمیں اپنے رویوں میں تبدلی کی نہیں بلکہ یکسر بدلنے کی ضروت ہے۔ ہم جس چیز کو اپنے رویوں میں شامل کرتے جا رہے ہیں یہ ہماری تہذیب میں کینسر کی طرح شامل ہو سکتا ہے۔ کینسر کا بروقت علاج نہ ہو تو اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے

اللہ ہمیں اپنی ذات اور اپنے معاشرے کا احاطہ کرنے اور خود کو راہ راست پر لانے کی توفیق دے

آمینَ دعا گو میاں وقار الاسلام

غیر معیاری سوچ کبھی معیاری معاشرہ تشکیل نہیں دے سکتی

تحریر : میاں وقارالاسلام

جب ہم انتخاب ایک آنکھ کے زاویے سے کرتے ہیں تو ہمیں ہماراانتخاب فرشتہ اور دوسرے کاانتخاب شیطان نظرآتا ہے، اسی طرح ہم سے اختلاف رکھنے والوں کو ہماراانتخاب شیطان اور اپناانتخاب فرشتہ نظرآتا ہے۔

دراصل ہم جو اپنے معیار کی بنیادیں رکھتے ہیں وہ انصاف پر مبنی نہیں ہوتیں، اسی لیے ہمیں اپنی چیزیں سونااور دوسروں کی چیزیں مٹی نظرآتی ہیں۔ ہم اپنی حماقتوں کی جنت میں رہتے ہیں اور جو ہم سے اختلاف کرے اُسے سمجھتے ہیں کہ ایک دن وہ دوزخ میں جلے گا۔

حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ہم سب کے سب ہی جہالت کی دوزخ میں جل رہے ہوتے ہیں۔ ہماری سوچ اپنے معیار کے لیے ضرورت سے زیادہ مثبت ہوتی چلی جاتی ہے اور دوسروں کی سوچ کے معیار کے بارے میں منفی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کبھی بھی نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم اپنی سوچ کے معیار کو تبدیل نہ کریں۔

جب تک ہماری سوچ میں ہم سے اختلاف رکھنے والوں تک وسعت نہیں آتی، نہ ہی ہم اپنا کوئی بھلا کر سکتے ہیں، نہ ہی ہم کسی اور کا کوئی بھلا کر سکتے ہیں۔

ایسی قوموں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو ترازو سیدھا نہیں رکھتی تھیں، ہماری سوچ کے ترازو میں بھی ہم اپنے پلڑے کو ہمیشہ بھاری رکھتے ہیں۔ ایسے دوہرے معیاروں سے ہم اپنی جہالت کو تقویت دینے کے سوااور کچھ نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے حالات کو بدلنے کے لیے اپنے غیر معیاری معیار تلف کرنا ہوں گے۔ تاکہ ہم ایک معیاری معاشرہ تشکیل دے سکیں۔

چمکنے کی صلاحیت

تحریر : میاں وقارالاسلام

میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر ذرے کو چمکنے کی بھرپور صلاحیت عطا کی ہے، چمکنے کی طاقت صرف وہ ذرہ نہیں رکھتا جو اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتا۔ ورنہ اللہ کی رحمت ہر ذرہ پر یکساں برستی رہتی ہے۔ ذرہ جب اپنی حقیقت پہچان لیتا ہے تو اس پر اس کے بنانے والے کے راز آشکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جو ذرہ رب کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو پوری دنیا تک اس کی روشنی پہنچتی ہے۔ جو ذرے اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتے وہ اپنی بے نوری پر روتے رہتے ہیں جبکہ نور کے خزانے ان کے دلوں میں ہی دفن رہتے ہیں۔

مصنف : میاں وقارالاسلام

تصنیف : بیسٹ لائف نوٹس

کوورڈ سٹانس

Covered Stance

تحریر : میاں وقارالاسلام

"اگر پاکستان کی تاریخ دیکھی جائے تو جو چیز تمام سیاست دانوں اور ڈیکٹیٹروں میں یکساں طور پر نظر آتی ہے وہ ہے" کوورڈ سٹانس

اب یہ " کوورڈ سٹانس" ہوتی کیا بلا ہے۔

جب بھی کوئی اقتدار سنبھالتا ہے تو اپنی بری کارکردی یا نالائقی کو چھپانے کے لیئے پچھلی حکومت کی بری کارکردگی یا نالائقی کے پیچھے منہ چھپاتا نظر آتا ہے۔ اپنے کلیئر سٹانس کو سامنے لانے کی بجائے ایک چور راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور اپنی تمام تر نالائقیوں کا بوجھ پچھلی حکومتوں پر ڈال کر جان چھڑالی جاتی ہے۔ اور یہ کوورڈ سٹانس بنیادی طور پر ان سب کے لیئے فیس سیونگ کا کام کرتا ہے۔

ناہم کسی کو اچھا کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی ہم کسی کو برا ثابت کر سکتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمیں سارے ظالم نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ہمیں ان کی مظلوم شکلیں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک سے بڑھ کر ایک نجات دہندے ہم پر مسلط کیے جاتے ہیں اور پھر انہیں نجات دہندوں سے ہمیں نجات بھی دلوائی جاتی ہے۔ کبھی یہی لوگ قوم کے صف اول کے محسن ہوتے ہیں اور کبھی صف اول کے مجرم اور یوں تختے پر تختہ پلٹا جاتا ہے۔

جانے ہم اپنی قوم سے کب سچ بولیں اور کب سیدھی بات کریں گے۔

مصطفٰی زیدی کا ایک شعر میرے ذہن میں اکثر گھومتا رہتا ہے

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں

تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

زیدی

قوم مجرم کون ہیں، قوم کے محسن کون ہیں کیا ہماری قوم اسی میں تقسیم ہوتی رہے گی۔

ہم اپنی اگلی نسل کو کیا دینے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے دو حصے ہو گئے اور ہماری قوم کے ہاتھ میں کوورڈ سٹانس تھما دیا گیا۔

نہ مجرموں کا پتہ نہ محسنوں کی خبر

بھٹو شہید ہے یا عدالت کا ایک سزا یافتہ مجرم یہ قصہ بھی تاریخ کے پنوں میں کھو گیا۔

ضیاء اور مشرف نے قانون کے توڑ کر ملک کا بھلا کیا یا ملک مشکلیں بڑھائیں یہ بھی سوالیہ نشان رہے گا۔

پی پی پی اور نون لیگ۔۔۔ ان کے پس پردہ بھی کئی راز ہیں یہ باری باری حکومتوں میں رہے اور اپنی کارکردگی تو کیا دکھانی تھی قوم کے سامنے ایک کوورڈ سٹانس رکھ کر چلتے رہے اور آج دونوں پارٹیوں کے سربراہ جیل میں ہے۔

اقتدار آج پی ٹی آئی کے ہاتھ میں ہے تو کیا قوم کو ایک بار پھر کوورڈ سٹانس۔۔۔۔۔ یعنی لال بتی کے پیچھے لگا یا ہوا ہے۔

ایسا کیا ہے کہ ان کی کھلی نالائقی پر بات نہیں کی جس سکتی اور کیوں نہیں کی جا سکتی یہ بھی تو ایک کوورڈ سٹانس لے کر چل رہے ہیں اور اپنی ساری غلطیاں ن لیگ اور پی پی پی کے پیچھے چھپانے میں لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ کیا یہ ایک اور کوورڈ سٹانس نہیں

زمین کو آسمان سے ملا دینے والے سارے دعوے خاک ہو گئے یوٹرن کے بھی کئی ٹرن ہو گئے مگر قوم کے کسی بھی اقتدار میں آنے والے نے سچ نہیں بولا

سیاست گندی نہیں ہے اور نہ ہی عدلیہ گندی ہے مگر دونوں اداروں کو ہمیشہ گندے طریقے سے چلایا گیا ہے نہ عدالتیں کبھی قوم کے سامنے سچ لانے میں کامیاب ہوئی نہ ہی سیاست دانوں نے کبھی سچ بولا ہے۔

فرض کر لیتے ہیں کہ آج تک جتنی بھی حکومتیں آئی ہیں سب سفر تھیں۔۔۔۔۔ یہ تو ہمیشہ منوایا جاتا رہا ہے تو اب بھی مان لیتے ہیں۔

مگر سوال ہمیشہ ایک ہی رہے گا اور ایک ہی رہنا چاہیئے کہ کارکردگی کیا ہے۔

ہر حکومت خود کو مسیحا بنا کر اقتدار میں آتی ہے اور خود کو ایک مسئلہ ثابت کر کے چلی جاتی ہے۔

خدا کے لیئے پاکستان پر رحم کریں، اسے مسیحا نہیں چند قابل لوگ چاہیں جو سیدھی طرح سے اپنے حصے کا کام کریں اور اپنی کارکردگی کی بنا پر آگے بڑھے نہ کہ ایک دوسرے کی نالائقیوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے اور ایک کوورڈ سٹانس کو سامنے رکھتے ہوئے قوم کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگائے رکھیں۔

کوورڈ سٹانس کا لولی پاپ سیاست دانوں سے چھین لینا چاہیئے اور اس ٹرک کی بتی بھی توڑ دینی چاہیئے جس کے پیچھے یہ عوام کو لگائے رکھتے ہیں۔

ایک قسم کا کوورڈ سٹانس ججز بھی رکھتے ہیں جو جھوٹے فیصلے لکھتے ہیں اور لکھتے آئے ہیں اور مجرموں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں اور ایک کوورڈ سٹانس اسٹیبلشمنٹ کا بھی ہے اور یہی قوم کو تقسیم کر دیتے ہیں پھر اکھٹا بھی کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ یعنی جیسے چاہا جاتا ہے ویسے کیا جاتا ہے۔

آج تک قوم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ جیل سے کون سا راستہ پارلیمان کو جاتا ہے۔۔۔۔

سنا ہے پیسہ لوٹنے والوں سے پیسہ نکلوایا جا رہا ہے۔۔۔۔ یہ سچ ہے یا کوورڈ سٹانس۔۔۔۔

خدارا کہیں کچھ تو سچ بولیں۔

سچ بولنے سے ملک مضبوط ہوتے ہیں اور قوم یکجا ہوتی ہے۔ جانے کوورڈ سٹانس کے ذریعے قوم کو کون سا شعور دیا جاتا ہے۔

اللہ ہمیں اپنی قوم کے ساتھ سچ بولنے کی توفیق دے آمین

کامیابی ہر انسان کا خواب ہے

تحریر : میاں وقارالاسلام

کامیابی ہر انسان کا خواب ہے اور وہ اپنے خواب کی تعبیر کے دن رات سر گرم ہے۔ ہر انسان اپنے ذہن میں کامیابی کا ایک نقشہ بناتا ہے اور پھر اپنی پوری زندگی اس کے حصول کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ بہت سے لوگ سائے کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور جب منزل پہ پہنچتے ہیں تو سایہ اندھیروں میں غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کی مسافتیں اتنی طویل ہوتی ہیں کہ زندگی ہار جاتی ہے۔ کچھ لوگ اپنا ہر تعلق اور واسطہ پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور جب وہ منزل پر پہنچتے ہیں تو بالکل تنہا رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سب کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں کچھ لوگ رب کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ سب کچھ پا کر بھی ناخوش رہتے ہیں اور کچھ سب کچھ لٹا کر بھی بے چین نہیں ہوتے۔

کامیابی ہر انسان کا خواب ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے کامیابی خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ کچھ لوگ تھک ہار کر خواب دیکھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے خواب ہی ٹوٹ جاتے ہیں، کچھ لوگوں کے خواب بھیانک روپ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ زندگی کی افسردگیوں سے ہی باہر نہیں نکل پاتے کہ خواب بھی دیکھیں تو کیا دیکھیں۔ کچھ لوگ اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے لوگوں کو خواب دیکھاتے رہتے ہیں اور وہ بھی ایک سے ایک سہانے، کچھ لوگ اپنے خوابوں کی تعبیر عام لوگوں کے خوابوں کے قبرستان پر بناتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنا دین بیچ دیتے ہیں، اپنا ایمان بیچ دیتیں ہے، ان کے لیے ان کے خواب ہی خالق و معبود ہوتے ہیں اور وہ اسی کرپرستش کرتے چلے جاتے ہیں۔ خوابوں کا دیوتا ساری زندگی ان سے چڑھاوے مانگتا رہتا ہے اور وہ لوگوں کا خون چوس چوس کر اپنے دیوتا کو خوش کرتے رہتے ہیں۔

ایسی کامیابی جس میں انسانی قدریں دم دوڑ دیں، اپنے دوست پیچھے رہ جائیں، والدین کی خبر نہ ہو، رشتہ داروں کا احساس نہ ہو، ہمسائے اجنبی ہو جائیں، اپنائیت صرف اور صرف اپنے مقاصد کے حصول تک رہے جائے ایسی کامیابی ایک سہانا خواب ہی تو ہے، جو انسان سوتے ہوئے نہیں بلکہ جاگتے ہوئے دیکھتا ہے اور ساری زندگی دیکھتا ہے، یہ خواب ٹوٹتا تب ہے جب انسان کو ابدی نیند آتی ہے۔

لوگ جانتے ہیں کہ ان کی کامیابیاں انہیں آخرت میں کچھ نہیں دے سکتیں مگر پھر بھی وہ اپنے پیٹ میں آگ کا سمندر بھرتے جاتے ہیں۔ بے چین رہتے ہیں بے تاب رہتے ہیں، ان کی ایسی کامیابیاں جو انہیں دنیا میں کسی قسم کا سکون نہیں دے سکتیں وہ آخرت میں انہیں کیا نجات دیں گی۔

انسان اپنے خوبصورت خوابوں میں قید ہے، کئی بستیوں کو انسانوں کے خوابوں سمیت الٹا کر رکھ دیا گیا تاکہ انسان سمجھے کہ حقیقی کامیابی کیا ہے۔ مگر انسان کی فطرت ہی بڑی ظالم ہے، وہ اس سے اسی کے نفس اور جان پر ظلم کرواتی ہے اور انسان اس پر ایمان لانے میں ہمیشہ جلدی کرتا ہے، اور ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔

حقیقی کامیابی کبھی ظالم لوگوں کو نہیں ملتی، کبھی ایسے لوگوں کو نہیں ملتی جو اپنے خوابوں کو اور اپنی خواہشوں کو معبود رکھتے ہیں، کبھی ان کو نہیں ملتی جو لوگوں کی خوشیاں چھین کر اپنے خواب پورے کرتے ہیں۔ بے چین اور بے تاب لوگوں کی ڈکشنری میں حقیقی کامیابی کا لفظ ہی نہیں ہوتا۔ انسان کو کامیابی کے ایسے خوابوں سے ڈرنا چاہیے جس کی تعبیر ناکامی سے سوا کچھ نہ ہو۔

شجرِ سایہ دار

تحریر: میاں وقارالاسلام

اللہ اسلام کی ایک مثال بیان کرتا ہے کہ ہم نے زمین سے ایک سوئی نکالی پھر وہ پودا بنی پھر وہ تن آور درخت بنی اور پھر وہ غیر مسلموں اور مشرکوں کا دل جلانے لگی۔

پھر اللہ فرماتا ہے کہ تم بہت کم تعداد میں تھے علاقے میں تمہارے قدم بھی مضبوط نہیں تھے پھر ہم نے تم پر اپنا فضل کیا اور تمہیں جماعت کثیر بنایا تمہارے علاقے میں قدم مضبوط کیئے اور تمہارا رعب اور دبدبا قائم کیا۔

پھر ایک اور جگہ بیان ہوتا ہے کہ یہودی، عیسائی اور مشرک لوگ چاہتے ہیں کہ اسلام کے چراغ کو پھونکوں سے بجھادیں۔ مگر کسی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے وہ کرکے ہی رہتا ہے۔

اللہ نے اگر آپ کو زندگی کے کسی میدان میں مضبوط کیا ہے تو اللہ چاہتا تھا کہ وہ ایسا کرے اور آپ کے پاوں جمائے، اگر آپ جماعت کی شکل میں ہیں تو اللہ چاہتا تھا کہ آپ کو کثیر تعداد میں کر دے، اسی طرح ہمیں جو بھی ملتا ہے یا ہمارے کام میں جو بھی برکت پڑتی ہے اس میں اگر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہو تو کچھ بھی باقی نہ رہے۔

پھر اللہ جو آپ کو دیتا جاتا ہے اس کی اسی دنیا میں آزمائش بھی کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ آپ کتنا رجوع کرنے والے ہیں اور کتنا شکر ادا کرنے والے ہیں اور جو آپ کو دیا گیا ہے اس میں سے کتنا لوگوں میں واپس بانٹنے والے ہیں۔

قران میں بہت سی مثالیں آتی ہیں جیسے ایک شخص کا باغ تھااور جو گماں کر بیٹھا تھا کہ یہ سب کچھ اسے اس کی محنت سے ملا ہے، اور وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اگر میں مر کر زندہ اٹھایا گیا تو مجھے پھر بھی یہی سب کچھ حاصل ہو گا جو مجھے یہاں حاصل ہوا ہے۔ پھر یہ بھی بیان ہوتا ہے کہ اس کا باغ برباد کر دیا گیا اور وہ حسرت زدہ ہو کر اپنی چھتریوں پر الٹا پڑا رہ گیا۔

ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ ناشکروں کا حال بہت برا ہوتا ہے، سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی انہیں چین اور سکون نہیں ملتا، وہ ہر وقت مایوسی اور فرسٹریشن کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات اور واقعات میں انہیں سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نظر نہیں آتا۔

شکر کرنے والوں کے چہروں پر اطمینان ہوتا ہے، انہیں کم ملے یا زیادہ ان کے حرص اور لالچ نہیں بڑھتی انہیں جب مضبوط کیا جاتا ہے تو غرور میں نہیں آتے انہیں جب کسی نقصان سے گزارا جاتا ہے تو مایوس نہیں ہوتے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ جس نے انہیں پہلے نوازا تھا وہ چاہے گا تو انہیں پھر نواز دے گا۔ اور یہ جب کثیر جماعت میں ہوتے ہیں تو اپنی جماعت کی وجہ سے اکڑ کر نہیں چلتے بلکہ ان میں مزید عاجزی اور انکساری آتی ہے۔

اگر اللہ نے آپ کو کسی اعزاز سے نوازا ہے تو شجر سایہ دار بنیں، آپ پر پھل لگتا ہے تو اس پھل کو بانٹیں اور اگر آپ پر ہریالی آتی ہے تو لوگوں پر سایہ کریں۔

تکبر اور خود پرستی کے درخت پر اول تو کوئی پھل ہی نہیں لگتا اور اگر لگ بھی جائے تو کڑوا کسیلا اور اسی طرح اس درخت پر ہریالی بھی نہیں آتی اور اس کا تنا سوکھ جاتا ہے تو اس سے سایے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ ناشکروں اور مغرور لوگوں کا نصیب اس لے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے۔

اللہ نے اگر آپ کو کوئی مقام عطا کیا ہے تو اللہ کے فضل کو پہچانیں۔ اور خود اپنی جگ ہنسائی کا سامان اکٹھا نہ کریں۔

عجیب لگتا ہے جب ایک مالا مال شخص بھوک سے مرنے کی بات کرتا ہے ایسا مالا مال شخص جس کی نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔

عجیب لگتا ہے، بڑا قلم کار مایوسی کی بات کرتا ہے حالانکہ اللہ نے اسے بڑا نام اور بہت عزت دی ہوتی ہے

عجیب لگتا ہے جب ایک بڑا عالم یہ کہتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے حالانکہ کہ اللہ نے اسے منتخب کیا اور اعلی مقام عطا کیا جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جو اپنے اپنے اداروں کے ہیڈ ہیں نام بھی رکھتے ہیں اور شہرت بھی اور سب کچھ حاصل کرنے کے بعد صرف مایوسی کی بات کرتے ہیں اور ان کے اندر کی فرسٹریشن ہے کہ ان کی جان نہیں چھوڑتی۔

اگر اللہ آپ کو عزت اور مقام دے سکتا ہے تو ذلیل اور رسوا بھی کر سکتا ہے جیسے کہ آپ ناشکرانی کرکے اپنے مقام کو خود گرانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ پھر بھی آپ خو سنبھال لیتا ہے۔ کیوں کہ جس مقام پر اللہ نے آپ کو بیٹھایا ہوتا ہے وہاں سے آپ گریں گے تو بہت سے لوگوں کا بھرم ٹوٹ جائے گا اور شاید اللہ آپ کا اور باقی لوگوں کا بھرم قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور آپ اندر سے جو کچھ بھی ہیں وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔

کوشش کریں کہ شجرِ سایہ دار بنیں آپ کی باتوں سے امید کا پیغام جانا چاہیئے جس خدا نے آپ کو عزت عطا کی ہے وہ چاہے تو بہت سے لوگوں کو عزت دے دے جن کو آپ یا تو کچھ نہیں سمجھتے یا پھر آپ کا تکبر آپ کی نظریں چندھیا دیتا ہے اور آپ کو نظر کچھ نہیں آتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نئی آنے والی جینریشن پہلے سے زیادہ علم اور طاقت رکھتی ہے، شعور اور وسائل رکھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری توقعات سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ تو جو فضل اللہ نے ہم سے نیچے والی جماعت پر کرنا ہے وہ کرنا ہے۔

جس اللہ نے ہماری جینریشن کو پڑھایا لکھایا بڑا کیا اور ہمارے لیئے رزق کے انتظامات کیئے، وہی رب اگلی جنریشن کا بھی رب ہے، وہ جانتا ہے کہ کب کس پر کتنا فضل کرنا ہے کتنا پڑھانا ہے اور کتنا آگے لے کر جانا ہے۔

اللہ اس بات کا محتاج نہیں کہ ہماری مایوسی اور فرسٹریشن کا بوجھ ہماری اگلی نسل پر بھی ڈال دے۔ اگر وہ چاہیے تو ہم ہی میں سے ایسی جماعت نکال کھڑی کرے جو ہر لحاظ سے ہم سے بہتر ہو اور وہ اس بات پر پوری طرح قادر ہے اور وہ ایسا کرتا آیا ہے۔

امید کرتا ہوں کہ آپ مایوسی پھیلانے والے بڑے بڑے نام نہاد بابوں کی عقل_ سلیم سے نقصان اٹھانے کی بجائے ایسے لوگوں کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے جو پر امید ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں۔

گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھیں، حالات کی گرمی سے آپ کا وجود محفوظ رہے گا۔ اور آپ کی زندگی میں انشاء اللہ ہریالی آئے گی

دعا گو میاں وقار الاسلام

گمنام ماہر تعلیمی کردار

تحریر : میاں وقارالاسلام

جہاں ہر بندہ خود غرض ہو وہاں ملک فلاحی ریاست کیسے بن پائے گا۔ پتا نہیں ملک فلاحی ریاست بن پائے گا یا نہیں کم از کم تعلیمی ادارے تو فلاحی ادارے ضرور بننے چاہیں۔

اگر تعلیمی ادارے ہی کاروبار کی آڑ میں خود غرضی اور لالچ سے بھرے پڑے ہوں تو ہم کس طرح کی نئی نسل کو سامنے لائیں گے۔

بہت سے اداروں کا پہلے سے ہی بیڑا غرق ہے کوششوں کے نام پر کیا کوششیں ہوتی ہیں مجھے نہیں معلوم۔ کیا ہم صرف تعلیمی اداروں کو فلاحی ادارے نہیں رہنے دے سکتے۔

تعلیمی اداروں کے سر براہان کا صاحب کردار ہونا بہت ضروری ہے اس طرح کے عہدوں کا کسی غیر ذمہ دار شخص کے ہاتھ میں چلے جانا بد قسمتی ہے۔

بہت سے تعلیمی ادارے ہیں جہاں عملے کو ہراساں کیا جاتا ہے بچوں کو بھی ہراساں کیا جاتا ہے بچے اغوا اور قتل بھی ہوتے ہیں یا پھر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف تعلیم کو کاروبار بناتے بناتے تعلیم اتنی مہنگی ہو چکی ہے کہ عام آدمی صرف دال چینی سے ہی محروم نہیں ہو رہا بلکہ مناسب تعلیمی سہولیات سے بھی محروم ہو رہا ہے۔

تعلیم کے حوالے سے مجھے نہیں معلوم کے ہمارے ملک کی کیا منصوبہ بندی ہے مگر بہت سے ممالک ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے اعلی تعلیمی میدان میں منوایا اور دیکھتے ہی دیکھتے معاشی طاقت بھی بن گئے۔

تعلیم ہمیں بہت کچھ دے سکتی ہے مسئلہ یہ نہیں مسئلہ یہ ہے ہم تعلیم کو کیا دیتے ہیں کہ تعلیم ہمیں واپس کچھ دے پائے۔

ایسا نہیں ہے کہ سارے ہی تعلیمی ادارے برے ہیں مگر جو تعلیمی ادارے برے ہیں وہ بے لوث محنت کرنے والے اداروں کا بھی حق مار رہے ہیں۔

بدماش قسم سے تعلمی ادارے ہر سطح پر حاوی ہو جاتے ہیں چاہے قانونی مسائل ہوں یا کوئی اور معاملات ہوں شریف اور بے لوث اداروں سے دب جاتے ہیں اور ان سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔

حکومت تعلیمی اداروں کا ماحول ٹھیک رکھنے کیلیے جرمانے لگاتی ہے جو طاقتور اداروں کے لیے معمولی بات ہے مگر محنت کرنے والے لوگوں کی حوصلہ افزائی ویسے نہیں ہوتی جیسے ہونی چاہیے۔

ایدھی کی طرح بہت سے لوگ ہیں جو خاموشی سے خدمت خلق میں لگے رہتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھتا نہیں ایسے لوگوں کی خبر ہمیں تب ہوتی ہے جب وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

میں اگر تعلیمی میدان میں اپنے ان اساتذہ کو دیکھوں جنہوں نے میری اور میرے جیسے کئی لوگوں کی زندگیاں بدلی ہیں تو میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ان کی زندگی طویل مسافت کے بعد بھی نہیں بدلی۔

ہمیں اپنے گمنام ماہر تعلیمی کرداروں کو پہچاننے کی ضرورت ہے انہیں عزت دینے کی ضرورت ہے ان کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے جنہوں نے ہماری ضروریات پوری کیں ہمیں ان کی ضروریات کا خیال رکھنا پڑے گا۔

بہت سے لوگ نیک نیتی سے تعلیمی میدان میں آتے ہیں اور بہت محنت کرتے ہیں اپنا مقام بھی بناتے مگر سرمایہ دار انہیں تباہ کر سکتا ہے کیوں کہ ہمیں بھی چمکتے ہوئے ادارے پسند ہیں۔

معاشرے میں اگر بدنیت ترقی کر رہے ہوں اور نیک نیت لوگوں کو اپنی نیک نیتی کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہو تو ہمیں یہ جاننے میں مشکل نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم کس سمت میں جا رہے ہیں اور ہمارے دائیں بائیں کون لوگ ہیں۔

ہم اللہ سے اپنی حالت پر رحم مانگتے ہیں مگر ہم خود اپنی حالت پر رحم کب کریں گے۔

دعا گو: میاں وقارالاسلام

کامیابی کا راستہ

تحریر: میاں وقارالاسلام

کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے باقی سارے راستے جھوٹے ہیں۔ وہی راستہ سچا ہے جس پر رب راضی ہوتا ہے۔

وہی راستہ سیدھا ہے جس پر اللہ کر پیغمبر چلتے رہے اور اللہ کے نیک بندے جس کی پیروی کرتے ہیں۔

جو رستہ مشکل ہو مگر آسانیاں لائے وہ بہتر ہے اس رستے سے جو آسان ہو مگر کسی مشکل میں پھنسا دے۔

جو لوگ فرعون کی کامیابیوں پر رشک کرتے تھے انہیں لوگوں پر فرعون کا انجام نشان عبرت بنا اور آگے آنے والے کے لیے مثال عبرت۔

کامیاب وہ نہیں جس کے پاس دو جہان کے خزانے ہوں بلکہ کامیاب وہ ہے جس کے پاس کچھ زاد راہ ہو جس سے اس کی آخرت سنورے۔

مسئلہ یہ نہیں کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ درست سمت اور غلط سمت کون سی ہے مسئلہ یہ کہ لوگ جانتے بوجھتے ہوئے غلط رستے کا انتخاب کرتے ہیں۔

یہ نہیں ہے کہ دنیا میں رزق کی فراوانی نہیں انسان نے اگلے 10 سال کا بندوبست کر رکھا ہے پھر بھی بھوک بڑھ رہی ہے اور بھوک سے مرنے والوں کی تعداد بھی۔

ایک طرف ایسے انسان ہیں جن کی 10 نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں دوسری طرف ایسے انسان ہیں جن کا دوڑنا بھاگنا بھی ان کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

جو لوگ پانیوں پہ قابض ہیں اللہ ان سے ضرور پوچھے گا کہ پیاس سے مرنے والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا

جو لوگ اناج پر قابض ہیں اللہ ان سے ضرور پوچھے گا کہ جو بھوک سے مر رہے تھے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

ان عالم فاضل لوگوں سے ضرور پوچھا جائے گا جنہوں نے علم کا حصول مہنگا کیا اور ان کے ماتحت لوگ جاہل رہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سوشل اینیمل ہے، پھر اگر وہ سوشل نہیں ہے تو پیچھے صرف اینیمل ہی رہ جاتا ہے۔

ایسی تعلیم جو ماں باپ کے آگے سرکش کر دے اس کا بھی کیا فائیدہ اور ایسا علم جو رب کی پہچان بھی نہ دے سکے ایسے علم کا بھی کیا فائیدہ۔

انسان اپنے لیے بھی یہی چاہتا ہے کہ دنیا میں کامیاب ہو اور اپنی اولاد کے لیے بھی یہی چاہتا ہے کہ دنیا میں کامیاب ہو۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے کہ انسان اپنی بھی آخرت کی فکر کرے اور اپنی اولاد کی بھی آخرت کی فکر کرے۔

جب پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا تھا۔۔۔۔ تو ہم کیا کہیں گے کہ ہم نے کامیابی کے کون سے رستے کا انتخاب کیا؟

اللہ ہمیں ہدایت دے کہ ہم جس بھی راستے کا انتخاب کریں اس کی منزل رسوا کرنے والی نہ ہو

دعا گو میاں وقارالاسلام

PRESERVE YOUR MARVELS

STORE YOUR KNOWLEDGE

پریزرو یور مارولز، سٹور یور نالج

اپنے ہیروز کا تحفظ کریں، اپنے علم کو محفوظ کریں

تحریر : میاں وقارالاسلام

ہمارے ہاں بہت ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں بہت کام کیا اور بڑا نام کمایا اور پھر اس دنیا سے چلے گئے ہمیں ایسے لوگوں کے شاید نام بھی معلوم نہ ہوں۔ ایسے لوگ جب بھی جاتے ہیں ایک خلا چھوڑ جاتے ہیں اور پھر ایک نسل کو دوبارہ صفر سے محنت کرنی پڑتی ہے کیوں کہ ہم انے ایسے شاندار لوگوں کے کام کو نہ تو اہمیت دی، نہ سیکھا، نہ آگے بڑھایا اور نہ ہی پریزرو کیا۔

2 سے 4 سالوں میں کسی بھی فیلڈ میں پی ایچ ڈی کی جا سکتی ہے، اگر پی ایچ ڈی کر بھی لی جائے تو وہ تجربہ حاصل نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ لوگ کسی فیلڈ میں اپنی پوری زندگی لگا کر حاصل کرتے ہیں۔ ہم ایسے بہت سے لوگ ہر دن ضائع کر دیتے ہیں اور ہماری ترقی کا سفر پھر صفر سے شروع ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں نئی جینریشن کو اولڈ جینریشن کی محنت پریزو کرکے فراہم کی جاتی ہے اور وہ اپنے صفر کا آغاز وہیں سے کرتی ہے۔ کامیاب لوگوں پر بکس لکھی جاتی ہیں ریسرچ پیپرز پبلیش ہوتے ہیں۔ ان کے نام پر اکیڈ میز بنتی ہیں، کالجز اور یونیورسٹیز بنتی ہیں اور ریسرچ سینٹرز بنتے ہیں اور ان کے کام کو بغیر کسی رکاوٹ کے تسلسل کے ساتھ چلایا جاتا ہے اور پھر انہیں کے اداروں سے ہمارے سٹوڈینٹس ملک کا وسیع سرمایہ خرچ کرکے پی ایچ ڈی کرکے آتے ہیں۔ ایم بی اے میں بہت سے ایسے لوگوں کی کیس سٹڈیز پڑھائی جاتی ہیں جو خود گریجویٹس بھی نہیں ہوتے۔ کیا ہمارے ہاں اس طرح کے تجربہ کار نان گریجویٹس نہیں ہیں جن کا کام کسی بھی پی ایچ ڈی سے بڑھ کر ہو۔ یقینا بہت ہیں مگر ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

ہمارے ہاں ہر میدان میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جن کا کام مثالی ہے مگر ان کے کام کی نہ تو حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور نہ ہی انہیں کوئی پہچان ملتی ہے۔ وہ اپنی انفرادی کپیسٹی میں اتنا کچھ کر جاتے ہیں کہ پوری سٹیٹ اپنی ساری مشینری کو استعمال کرتے ہوئے بھی نہیں کر سکتی۔ پھر آپ سوچیں کہ اگر ان پر تھوڑی سی توجہ دے دی جائے تو وہ کیا سے کیا کر دیکھائیں گے۔

پاکستان میں ایسے بہت سے گروپس ہیں جن کے مالک زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر انہوں نے بہت سی فیکٹریز یا لگائیں اور اپنے کام کو پھیلاتے چلے گئے۔ پھر ان کی نئی جینریشن جو امریکہ یا برطانیہ سے اعلی تعلیم حاصل کر کے واپس آئی تو ان فیکٹریوں کو بڑھانا تو دور کی بات سنبھال بھی نہیں پائی اور ان کے والد کی لگائی ہوئی فیکٹریاں کچھ بند ہو گئیں کچھ خسارے میں چلی گئیں۔ اگر وہ اپنے بڑوں سے کچھ تجربہ لے لیتیں تو شاید ان کا کاروبار کبھی نیچے نہ آتا۔

اب نئی جینریشن پھر صفر سے سب کچھ شروع کرے گی ہو سکتا ہے مار کھا کھا کر وہ کامیاب بھی ہو جائے مگر پھر وہ اپنے تجربات کو محفوظ کرنے کی بجائے کہیں گم کر کے چلی جائے گی۔ اور پھر نیا سفر صفر سے باندھنا پڑے گا۔

ہماری ایک حکومت کوئی کام کرتی ہے تو دوسری کو نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا ہے مطلب کوئی حکمت عملی نہیں کوئی ویژن نہیں۔

قومیں 100 سال سے بھی زیادہ کی منصوبہ بندی کرتی ہیں اور پھر سیڑھوں کی طرح اوپر کی طرف چلتی ہیں اور پھر چلتی ہی چلی جاتی ہیں انہیں رائزنگ نیشنز کہتے ہیں۔ یہ قومیں اپنی مجموعی محنتوں کا تحفظ کرتی ہے اور اپنی محنتیں ضائع نہیں کرتیں اور اس طرح وہ دنیا میں ایک مثال بن کر ابھرتی ہیں۔

اگر اللہ نے آپ کو کوئی صلاحیت دی ہے اسے کم سے کم اپنی سطح پر ضرور محفوظ کریں کیوں کہ جو نالج اور تجربہ آپ کو دیا جاتا ہے یہ آپ کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ آپ کو اس لیئے تیار کرتا ہے کہ آپ سے لوگوں کی فلاح کا کام لے۔ تو جو علم اور تجربے کی امانت اللہ نے آپ کو دی ہے اسے اپنی حد تک ضرور محفوظ کریں اور اسے نئی جینریشن کے حوالے کرتے جائیں آپ دیکھیں گے کہ آپ کے خواب آپ کے ارد گرد ہیں تعبیر ہونے لگیں گے۔ بجائے اس کے کہ آپ اپنا تجربہ اور علم کسی صندوق میں یا پھر اپنے اندر ہی رکھ کر ہی دفن ہو جائیں۔ علم ایک قرض ہے جو آپ پر اتارنا واجب ہے۔

رہی گورنمنٹ کی بات تو اسے چاہیئے کوئلے کی کان میں ہاتھ ڈالے اور اس طرح کے نایاب ہیروں کی تلاش کرے انہیں سنوارے اور سامنے لائے تاکہ جو بے نوری ہمارے معاشرے میں نظر آتی ہے اسے ختم کیا جاسکے۔

ہم جن معاشروں سے علم اور آگہی ڈھونڈتے ہیں وہ ہمارے ہی علاقوں سے ہر سال طرح طرح کے ہیرے چوری کرکے لے جاتے ہیں اور ہم اپنی بے بسی کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہمیں اپنے مارولز کی پہچان کرنی پڑے گی اور ان کے تجربات کو محفوظ کرنا پڑے گا یا پھر ہماری محنتیں یوں ہی رائیگاں جاتی رہیں گی

حقیقی اور تصوراتی دنیا

تحریر: میاں وقارالاسلام

ویسے تو یہ دنیا ہم سب کے لیے ایک ہی دنیا ہے۔ دوسری طرف اگر تصور کیا جائے تو ہم ایک سے زیادہ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ جیسے ہمارے ذہن میں جنت اور دوزخ کا تصور ہے ویسے ہی ایک کچھ دنیاؤں کا وجود ہمارے دل میں ہوتا ہے اور کچھ دنیاؤں کا وجود ہمارے دلوں میں ہوتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی دنیا کو خوبصورت دیکھنا اور بنانا چاہتے ہیں ویسے ہی ہم اپنے تصور کی دنیا کو بھی خوبصورت دیکھنا اور بنانا چاہتے ہیں جس کا وجود یا تو ہمارے دلوں میں ہوتا ہے اور یا پھر ہمارے دماغوں میں۔

جوں جوں ہم بڑے ہوتے ہیں ہماری حقیقی دنیا ہمارے سامنے رنگ بدلتی نظر آتی ہے اور اچھے، برے یا مشکل حالات سے ٹکراتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہمارے اندر کی دنیا بھی حالات کا سامنے کرتے ہوئے مختلف انداز سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس طرح ہم اپنے باہر کی دنیا کو مختلف روپ میں دیکھتے ہیں ویسے ہی ہمیں ہمارے اندر کی دنیا مختلف روپ میں ملتی ہے۔ بعض دفعہ یہ بدلتے ہوئے روپ ہم دوسروں کو بیان کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہتے ہیں اور بعض دفعہ ہم اسے بالکل بھی بیان نہیں کر پاتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تصور کی دنیا یا تو کھل کر باہر آجاتی ہے یا پھر کہیں دبی سی حالات کی راکھ کے نیچے سلگتی رہتی ہے اور کوشش کرتی رہتی ہے کہ ہم حالات سے لڑتے رہیں اور اس کے کے وجود کو باہر لا سکیں۔

باہر کی دنیا ہمیں کچھ اور بنانا چاہتی ہے جسے کہ ڈاکٹر، انجنیئر، وکیل، استاد یا پھر کوئی بھی اور کاروباری، سیاسی یا سماجی کارکن۔ اور ہمارے اندر کی دنیا ہمیں کچھ اور بنانا چاہتی ہے جیسا کہ مصور، شاعر، گلوکار، افسانہ نگار یا پھر فن یا پھر کھیل سے متعلق کچھ جیسا کہ کرکٹر، فٹ بالر یا کوئی کوئی بھی اور کھیل۔

باہر کی دنیا ہمیں پریکٹیکل دیکھنا چاہتی ہے مگر اندر کی دنیا ہمارے شوق کی تسکین چاہتی ہے۔ جس طرح ہمارا پریکٹیکل کریکٹر ہوتا ہے اسی طرح ہمارا ایموشنل کرکٹر ہوتا ہے۔

ایک موٹیویشن یا انسپائیشن ہم پر مسلط کی جاتی ہے اور ایک ہمارے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ایک شخص اچھا دوڑ سکتا ہے مگر اس سے جمپنگ کروائی جاتی ہے یا پھر ایک شخص اچھی جمپنگ کر سکتا ہے مگر اس سے دوڑ لگوائی جاتی ہے۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے اندر کے احساسات اور باہر کے محرکات ایک ہی پیج پر آ جائیں۔

ہماری باہر کی دنیا یہ زور لگاتی رہتی ہے کہ وہ ہمارے اندر جگہ بنا سکتے اور ہمارے اندر کی دنیا یہ زور لگاتی رہتی ہے کہ وہ باہر کی دنیا میں اپنی جگہ بنا سکے۔

جب ہم اپنے اندر کی کشمکش کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں تو ہمیں اس صورتِ حال کا مختلف انداز میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ہر انسان اس طرح کی صورتِ حال سے گزر چکا ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے تجربات کے لحاظ سے اس کا جواب دیتا ہے۔ کچھ لوگ ہماری کشمکش کو پوری طرح دبانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کچھ لوگوں کو دبا بھی دیتے ہیں، کچھ لوگ ہاں اور ناں کے درمیان رہتے ہوئے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے اور تیسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ہماری کشمکش کو بہترین راستہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے ہیں۔

والدین اپنے بچوں کو اگر ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے بچے کی کسی اور خوبی کی طرف غور ہی نہیں کرتے یوں بچوں کی اندر کی دنیا وہیں دب جاتی ہے مگر مرتی نہیں اور وہ اپنی کشمش کا دائیں بائیں اظہار کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں بعض دفعہ خطرناک حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے کیوں کہ لازمی نہیں کہ ان کا سننے والا ان کے ساتھ مخلص بھی ہو۔ یا پھر انہیں کوئی دوست، استاد یا ساتھ ایسا بھی مل سکتا ہے جو ان کی کشمکش کو درست موڑ دے دے اور وہ شروع ہی سے درست راہ کا انتخاب کر پائے۔

بچپن کی بات ہے جب میری شاعری کو شاعری بھی نہیں کہا جا سکتا ہے، جب میرے والد نے اس دیکھا تو کچھ خاص حوصلہ افزائی نہیں کی، فطری سی بات ہر کوئی بھی والد نہیں چاہے گا کہ اس کا بچہ اپنی تعلیم کو کمپرومائز کرے۔ شاید اسی وجہ سے آج تک شاعری میرا آخری شوق ہی رہی۔ مگر میں نے اس شوق کو کبھی مرنے نہیں دیا۔

شاعری میرے آخری شوق تک رہنے کے باوجود بھی مجھے بہت کچھ دے پائی، شاعری نے مجھے موقع دیا کہ میں اپنی اندر کی دنیا کو مسخر کر سکوں اور اپنے احساسات کو باہر لا سکوں۔ شاعری نے مجھے وہ انسان بھی بنا دیا جو مجھے میرے تعلیمی ادارے کبھی نہیں بنا سکتے تھے۔ شاعری میرے اندر محبت

سے بھرے ہوئے جذبات کو لے کر چلی جس کی وجہ سے میں اپنے تک آتی ہوئی ہر محبت کو محسوس کر سکا اور اسی احساس کے ساتھ اسے لوگوں تک واپس بھی پہنچا سکتا۔ شاید اسی سفر میں میں نے اپنے رب کی تلاش بھی کی انہیں جذبات سے قران کو بھی پڑھا اور اسی جذبات سے لوگوں کو بھی سمجھا۔ شاعری اگر میری ہمسفر نہ ہوتی تو شائید ایک ادھورا پن میرے اندر ضرور رہ جاتا۔

جب میں کسی نئے لکھنے والے سے ملتا ہوں یا بات کرتا ہوں، تو اسے کبھی نہیں روکتا کہ وہ اپنے شوق کو دبنے دے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں کہ وہ اپنے اندر کی دنیا کو باہر لانے کی کوشش ضرور کرے اور ساتھ یہ مشورہ بھی دیتا ہوں کہ باہر کی دنیا بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ اندر کی دنیا، شوق اس حد تک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے آپ کی تعلیمی، کاروباری، سماجی یا پھر نجی زندگی اثر انداز ہونے لگے۔ اندر اور باہر کی دنیا کا تواز بہت ضروری ہے کیوں کے توازن برقرار نہ رہے تو کچھ بھی برقرار نہیں رہتا۔

امید پر دنیا قائم ہے

تحریر : میاں وقارالاسلام

ہم نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب جیل سے سیاست دان مذید سیاسی ساکھ حاصل کرکے میدان میں آتے تھے اور بڑی واضع برتری کے ساتھ جیت کر پھر ایوانوں میں بیٹھ جاتے تھے۔

تمام بڑے سیاست دان وہی ہیں جنہوں نے جیلیں کاٹی ہیں اور اب وہی سب سیاست کی اعلی ڈگری لینے پھر سے جیل گئے ہیں۔

پی ٹی آئی سے پہلے بھی تو سیاست دانوں کو جیل جانے کے اعلی سطحی شوق تھے۔ اور اگر یہ شوق دوبارہ پورے ہو رہے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ خدا کرے کہ عدالتیں سیاست دانوں کے شوق پورے کرنے کی بجائے احتساب کو یقینی بنائے

ایک طرف تو تبدیلی کا سورج ابھی طلوع ہی نہیں ہو رہا اور دوسری طرح موروثی سیاست کا سورج ڈوب چکا ہے۔ اور معیشت پر اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ سیاہ رات کٹے گی امید تو اچھی ہی رکھنی چاہیئے۔

دیکھنا یہ بھی ہے کہ جب بے ایمانوں سے حساب مانگا جاتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ عوام صبر کرے

اور آج جب ایمان داروں سے حساب مانگا جاتا ہے تو وہ بھی کہتے ہیں صبر عوام بچاری صبر کرتی آئی ہے اور صبر کر رہی ہے اور صبر کے ساتھ امید بھی لگائے بیٹھی ہے کہ کاش تبدیلی کے وعدے پورے ہوں

پاکستان میں ڈالر نے بھی بڑی کرپشن کی ہے ہر دور میں بڑھ جاتا ہے چھوٹے قد والے چیف جسٹس صاحب ہوتے تو ایک دن میں سو پر سو کر دیتے۔ خدا جانے کہ پہلے عوام کے ساتھ مذاق ہو رہا تھا یا کہ اب ہو رہا ہے۔

سیاست کے ایک طرف چالاکوں کی بستی ہے اور دوسری احمقوں کا گاؤں ہے۔

اسد عمر کو معیشت کا ارسطو بنا کر پیش کیا گیا، اور ایسے ایسے دعوے کیے گئے کہ زمین کو آسمان سے ہی ملا کر غلط ملط کر دیا گیا، اور پھر تبدیلی کا ایک سال پورا ہوتا ہے اور عوام پوری طرح سے دھڑام سے نیچے آ گرتے ہیں۔ اسد عمر جس کا چہرا نجات دھندہ کا نظر آتا تھا اس کے پیچھے سوائے نحوست کے کچھ نہیں نکلا۔ پی ٹی آئی کا پہلا سال برباد کرنے پر اسد عمر کو جیل میں ہونا چاہیئے تھا۔

الطاف، زرداری اور نواز شریف کو اس کے حواریوں نے کئی بار پھنسوایا، خان صاحب بھی اپنے ارد گرد ایسے ہی حواریوں سے محتاط رہیں۔ فواد چوھدری جیسا جاہل انسان اگر پی ٹی آئی عقل مندیاں بیان کرے گا تو پھر تبدیلی کا خدا ہی حافظ ہے۔

عوام کے ایک ہاتھ میں تھمز اپ ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں تھمز ڈاون، ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ بری کارکردگی پہ بھی تھمز اپ مل جائے۔

خان صاحب کو چاہیئے کہ اب نواز اور زرداری فوبیا سے خود بھی باہر آئیں اور اپنی جماعت کو بھی اس فوبیا سے باہر لائیں اور کام کریں۔

جب بندہ خود امتحان میں بیٹھا ہو تو اسے چاہیئے توجہ سے اپنا پیپر مکمل کرے بجائے اس کے کہ نالائق طلبہ کی ماسٹر کو شکایت کرتا رہے۔

میں پی ٹی آئی کی ہر فورم پر حمایت کرتا ہوں، مگر پی ٹی آئی کی حماقتوں کی ایک لسٹ بھی ہے جس کی حمایت گناہ سمجھتا ہوں۔

مانا کہ کہیں کوئی کرپشن نہیں ہوئی، مگر گاڑی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی ہے نہ ڈرائیور کو تنخواہ دی نہ پیٹرول ڈالا نہ ہی گاڑی کی مرمت کا خرچہ ہوا، مگر اب تو گاڑی چلنی چاہیئے۔

مانا کہ پی ٹی آئی خراب گاڑی کو ٹھیک کر رہی ہے پچھلے سال والا معاشی مکینک تو بھاگ گیا اب دوسرا معاشی مکینک اسے ٹھیک کرنے آیا ہے اللہ کرے اس بار گاڑی چل پڑے

پی ٹی آئی خود کو خطروں کی دلدل میں پھنسا ہونے کا تاثر دے رہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اب پی ٹی آئی کو کسی سے بھی خطرہ نہیں، اور ان کی یہ معصومیت شاید زیادہ دیر ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اب تو سوال صرف اور صرف پی ٹی آئی کی کارکردگی کا ہی باقی ہے

یہ سال پی ٹی آئی کا کاؤنٹ ڈاؤن بھی ثابت ہو سکتا ہے، پچھلے سال کا خسارہ بھی باقی ہے اور اس سال کی کارکردگی بھی باقی ہے۔

ڈرائینگ روم ڈسکشن اور پرائمنسٹر سپیچ میں بہت فرق ہوتا ہے، غلط الفاظ نکالنے سے بہتر ہے پرچی رکھ لی جائے کیا مدینہ کی نئی ریاست میں یہ عمل شرعی طور پر جائز نہیں وہ سب جائز ہے جس سے پاکستان کی بہتری ہو

ڈالر ایک سو ساٹھ روپے سے بھی زیادہ ہو گیا، بڑی عید تک 180 کا بھی ہو سکتا ہے خان صاحب آپ کی مہربانی ڈبل سینچری نہ کرنا۔ عوام کو آپ کی وجہ سے بڑا شعور آ چکا ہے یہی شعور آپ کے وزیروں کے گلے کی گھنٹی نہ بن جائے۔

جس امید پر دنیا قائم ہے، اسی پر پی ٹی آئی قائم ہے۔ اور اسی امید پر ہم پی ٹی آئی سے بہتر کارکردگی کی امید کرتے ہیں۔ اللہ پاکستان کے حق میں بہتری کرے آمین۔

مشینوں کاانسانوں پر قبضہ

تحریر: میاں وقارالاسلام

اگر دیکھا جائے تو آج کاانسان ایک طرح سے پہلے ہی مشینوں کے قبضے میں ہے۔ اور ٹیکنالوجی سے محبت کرنے والے، نہ صرف اپنی دلچسپی بلکہ ٹیکنالوجی سے اپنی والہانہ محبت میں مشینوں کے یہ قبضہ فراہم کر چکے ہے۔ اور نہ صرف قبضہ فراہم کر چکے ہیں بلکہ نظر رکھے ہوئے ہیں کہ ٹیکنالوجی ان سے مذید اختیار مانگے اور وہ اپنا اختیار دیتے ہی چلے جائیں۔

ٹیکنالوجی کاایک چہرہ بڑاروشن ہے، جس کے ذریعے ہمیں جدید ترین سہولیات سے مذین کیا جاتا ہے۔ پہلے انسان کے بہت سی چیزوں کو خود کار کیا، مگر انسان کو کم سے کم خود اُٹھ کر بٹن دبانا پڑتا تھااور کام ہونے لگتے تھے۔ اس کے بعد ٹیکنالوجی نے مزید ترقی کی اور اس کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول آگیا، تو وہ جو بھی کرنا چاہتا تھااس کے لیے اسے بس ریموٹ اٹھانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

پھر انسان نے مزید ترقی کی اور اس کے پاس پروگرام ایبل مشینیں آ گئیں، بس مشین کو سیٹ کرنا پڑتا ہے اور مشین خود کام کرنے لگتی ہے، بس ایک چیز کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ، بجلی نہ جائے یا بیٹری کی پاور ختم نہ ہو اور تیسرا انٹرنیٹ کا لنک ڈاؤن نہ ہو۔ پھر انسان نے مذید ترقی کی، پاور کے بیک اپ، آ گئے، انٹرنیٹ کے متبادل لنکس اور بہتر لنکس آ گئے اور بیٹریز پیکس اور پاور بنکس نے بھی پانی جگہ بنالی۔

پھر دو چیزیں اور ہوئیں، ایک تو روبوٹیکس نے اپنی جگہ بنانا شروع کی، یعنی خوکار چلنے والی مشینیں، روبوٹیک آرمز یا پھر پورے پورے روبوٹس۔ اور اسی طرح سے آواز یا پھر اشاروں سے چلنے والے سسٹم بھی ایجاد ہے گئے، ہزار طرح کے سینسر ز نے جگہ بنانا شروع کی، ایسے سینسر جو فنگر تھم، فیس مگ، بول چال، نقل حرکت اور اشارے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ صرف اس مشین کے آپریٹ کرنے والے کے اپنے اشارے بھی۔

100 سے زائید دنیا کی امیر ترین کمپنیاں، اپنی ہزاروں قسم کی مصنوعات تیار کرکے بیٹھی ہیں، ان کے لیب میں تمام تجربات بھی مکمل ہیں اور ان کی سیلی کان ویلیز ان تمام مصنوعات کے گذشتہ 20 سالوں سے استعمال بھی کر رہی ہیں اور دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں یہ تحقیق بھی ہو چکی ہے کہ یہ مصنوعات کس طرح سے انسان کی زندگی کو یکسر بدل دیں گے اور ان مصنوعات سے مثبت اور منفی کس کس طرح سے اثرات ظاہر ہوں گے اور دیناکا معاشی نظام کس طرح سے تبدیل ہوگا۔

جب کمپیوٹر انسان کی زندگی میں شامل ہوا تو اس نے انسان کی زندگی کے ہر پہلو کو بدل کر رکھ دیا، سکولوں، گھروں، دفتروں فیکٹریوں، دوکانوں ہسپتالوں، سرکاری اور پرائیویٹ اور سوشل سیکٹر شاید ہی زندگی کا کوئی پہلو ہو جس پر کمپیوٹر اثر انداز نہ ہوا ہو۔ بڑے شہروں سے لے کر دور دراز کے چھوٹے چھوٹے گھروں اور یہاں تک کہ گھروں کے ایک ایک کمرے میں کمپیوٹر اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔

پھر اس کے بعد موبائل نے اپنی جگہ بنائی اور بناتا ہی چلا گیا، اور بہت جلد ہم نے دیکھا کہ شاید ہی دنیا میں کوئی ہاتھ بچا ہو جس کے ہاتھ میں موبائل نہیں ہے، کیا بچے، کیا بوڑھے اور کیا نوجوان، موبائل ہاتھ میں نہیں تو کچھ بھی نہیں، اور اگر سال میں ایک یا دو بار موبائل بدلا نہ جائے تو بھی زندگی کا مزا جاتا رہتا ہے۔

کمپیوٹر کیا انڈسٹری بہت بڑی تھی، مگر موبائل کی انڈسٹری نہ صرف کمپیوٹر کی انڈسٹری سے بہت بڑی تھی، بلکہ اس سے زیادہ منافع بخش بھی تھی اور اس سے زیادہ تیز بھی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے 1 جی سے 5 جی کچھ ہی سالوں میں ہمارے سامنے ہے۔

آگے آنے والا دور اس سے بھی زیادہ تیز ہے، آج کا نوجوان ہر وقت موبائل میں گھسا ہوا ہے، اور آگے آنے والے نوجوان انسانوں سے زیادہ موبائل اور اس کے لنک ہوئی چیزوں سے باتیں کر رہے ہوں گے۔ آنے والے نوجوانوں کے ہاتھ میں موبائل نہیں بلکہ موبائل سسٹم ہو گا جس سے وہ براہ راست باتیں کرتے ہوئے سوئیں گے اور باتیں کرتے ہوئے اٹھیں گے۔ اور یہ سب ہمارے سامنے ہونے جا رہا ہے اور بہت جلد ہونے جا رہا ہے اور کسی حد تک تو ہو بھی چکا ہے۔

باتیں کرنے والی کاروں کے آنے سے پہلے باتیں کرنے والے کھلونے مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ کچھ کھلونے موبائل سے بھی آپریٹ ہوتے ہیں۔ اور موبائل سے ہم پہلے سے ہی بات کرنے کی سہولت رکھتے ہیں، کچھ لوگ اسے استعمال کرتے ہیں اور کچھ اسے استعمال نہیں کرتے، مگر اب یہ عین ممکن ہے کہ ہم اپنے گھر میں موجود تمام برقی چیزوں سے براہ راست بات کر سکیں اور انہیں اپنے موڈ اور مزاج کے مطابق پروگرام کر سکیں۔ تو کچھ اس طرح کی زندگی ہمارے سامنے رونما ہونے کے لیے تیار ہے۔

ایک طرف ہم پر مشینیں آدھا قابو تو پا چکی ہیں اور باقی کا آدھا قابو ہم پر بہت جلد پا لیں گی، مگر یہ وہ قابو ہے جو ہم مشینوں کو اس لیے دیں گے تا کہ وہ ہمیں روزمرہ کی سہولیات فراہم کر سکیں اور ہماری زندگی پہلے سے زیادہ سہولیات سے آراستہ ہو سکے۔

دوسری طرف حکومتیں بھی ہمیں انہیں مشینوں سے قابو کر رہی ہیں حکومت کے پاس ہمارے فنگر تھم اور فیس ٹیمپلیٹ پہلے سے ہی موجود ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں کسی بھی پبلک پلیس یا ملک سے باہر آتے جاتے باآسانی شناخت کیا جا سکتے ہے، اور اس طرح ملین آف ملین فیس ٹیمپلیٹس اور بائیو آئی ڈیز مشینوں کے پاس پہلے سے ہی موجود ہیں جنہیں حکومتیں اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی چلی آ رہی ہے۔ یعنی صرف ایک شخص کی بائیو آئی ڈی سے اس کے پور خاندان اور پورے شہر کے ریکارڈ کا آپس میں موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

تیسری طرف ہم یہ ڈیٹا پرائیویٹ کمپنیوں کو بھی دے چکے ہیں جیسے موبائل کمپنیاں اور بنکس اور اسی طرح کی دیگر خدمات فراہم کرنے والی کمپنیاں اور موبائل میں موجود بائیو آئی ڈی ان ایبل ایپس۔

چوتھی طرف مشینوں کو انسان کی سیکیورٹی اور سیفٹی کے لیے بھی تیار کیا جا رہا ہے، سی سی ٹی وی پہلے سے گھروں، دفتروں اور گاڑیوں میں نصب ہو چکے ہیں۔ چین نے انہیں کیمروں کی کیپیسٹی کو بڑھایا تو پورے کے پورے شہر کے ہر ایک بندے کی نقل و حرکت کو دیکھا جاتا رہا۔ اور اسی طرح سے کہیں بھی یہ کام باآسانی کیا جا سکتا ہے کیوں کہ بائیو آئیڈیز تو پہلے سے ہی حکومت اور ایجنسیوں کے پاس محفوظ ہیں۔

پانچویں طرف، ایسی مشینیں تیار کی جا رہی ہیں جو کہ خودکار ہیں، یعنی پبلک ڈرون اناؤنسمنٹ سسٹم کے ذریعے لوگوں کے وارنگ دینا، گیٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعے لوگوں کو روکنا اور ریلیز کرنا، یہ بھی چین میں ابھی ابھی تجرباتی طور پر استعمال ہو چکا ہے۔ یعنی پبلک وارننگ سسٹم پہلے سے تیار ہے۔ خودکار سپرے ڈرونز اور خودکار سپرے مشینز اور اور خودکار کار گو سروسز بھی چین کے شہر وہان میں استعمال ہو چکی ہے۔ یہ تو خیر ایمرجینسی میں ایپڈیکس کے لیے استعمال ہوئی اور وہ بھی تجرباتی طور پر۔

خودکار روبوٹس، خودکار ڈرونز، خودکار گاڑیاں نہ صرف پبلک کو کنٹرول کرنے کے لیے تیار ہیں بلکہ انہیں جنگی حالات میں خودکار ہتھیاروں کے طور پر بھی تیار کیا جا سکتا ہے، یعنی مارکیٹس میں ایسے کیمرے لگ سکتے ہیں جن میں گن نصب ہو، اور خودکار ڈرونز اور خودکار گاڑیوں کو بھی خودکار ہتھیاروں سے لیس کیا جا چکا ہے۔ خودکار گاڑیاں 500 کلومیٹر شہر سے باہر اور 130 کلومیٹر شہر کے اندر خودکار طریقے سے چلائی جا چکی ہیں۔

ایک طرف خودکار کیریرز ہیں، دوسری طرف خودکار ہتھیار ہیں اور تیسری طرف انسانوں کی بائیو آئیڈیز ہیں، اور چوتھی طرف ان کا سیٹلائٹ اور 5 جی نیٹورک کے ساتھ لنک ہے۔ یہ ایک مکمل خودکار ویپن سسٹم ہے جو نہ صرف بارڈر ٹو بارڈر فوجیوں کے درمیاں استعمال ہو سکتا ہے بلکہ شہروں

اور دیہاتوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے، اور اسے جنگلوں، سمندروں اور دریاؤں تک بھی بڑھایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے روبوٹ تو پہلے سے ہی تیار ہو چکے ہیں جو پانی، ہوا، ریگستان، اور جنگلوں میں چلنے پھرنے، تیرنے اور اُڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مشین ہمیں تین طرح سے کنٹرول کرتی جارہی ہے، ایک سہولیات کے نام پر، اور دوسرا سیکیورٹی کے نام پر اور تیسرا معاشی ترقی کے نام پر۔

اللہ تعالی نے انسان کو جو دماغ دیا ہے اس کی ایک خاصیت ہے کہ وہ آگے کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اور یہ دوڑ انسان کو آج یہاں تک لا چکی ہے، انسان کے آگے کہاں تک اور کتنا جانا ہے یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے۔ مگر ایک بات طے ہے، زندگی رہے گی، تو پہلے جیسی کبھی نہیں رہے گی۔ ہر دور پہلے دور سے بہت مختلف ہو کر سامنے آتا ہے، اور دنیا یہ تبدیلیاں پہلی دفعہ نہیں دیکھ رہی۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس

تحریر : میاں وقارالاسلام

آپ نے ہزاروں سال پرانی ہمزاد کی کہانیاں تو سنی ہوں گی، جس میں یہ کہا جاتا تھا کہ ہر شخص کے ساتھ ایک ہمزاد پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی کہ کچھ انسان اچھی خاصی ریاضت کے بعد اسے اپنے بس میں کر لیتے ہیں اور پھر اس سے اپنے جائز اور ناجائز کام کرواتے ہیں، اور پھر یہ بھی کہ جب انسان بوڑھا ہونے لگتا ہے تو اس کا ہمزاد ایک نیا جسم تلاش کرتا ہے اور پھر اس میں گھس جاتا ہے اور اس طرح وہ ہزاروں سال زندہ رہتا ہے۔ بچپن میں ایسی کچھ کہانیاں میں نے بھی پڑھی تھیں تو تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان شروع سے ہی اپنی پاورز منتقل کرنے کا خواہش مند رہا ہے، یا پھر دوسروں کی طاقت کو اپنے قابو میں کرنے کا خواہش مند رہا ہے جیسے جنوں کو قابو کرنا یا پھر جادو کا سہارا لینا۔ ہم سب نے ان سارے معاملات پر کچھ نہ کچھ پڑھ رکھا ہے اور مختلف کہانیاں سن رکھی ہیں۔ آج بھی کالا جادو اور پتا نہیں کیا کیا ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے، شاید یہ بھی اسی خواہش کی کوئی تسکین ہے۔

اب دوسری طرف آتے ہیں سائنسی تحقیق، انسان نے شروع شروع میں مکینکل میشنری بنائی تو اپنے بہت سے کام اس مشین سے لینا شروع کیے یہاں تک کہ میتھی میٹکل اور لاجیکل پراسس بھی اس نے مشین کے ذریعے مکمل کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی اور پھر یہ مکینکل سے ڈیجیٹل دنیا میں آ گیا۔ شروع شروع کی ڈیجیٹل دنیا پراسسنگ اور سٹورتیج کے حوالے سے بہت محدود تھی مگر انسان کرنا وہی چاہتا تھا جو وہ آج کرنا چاہتا ہے۔

1951 میں باقاعدہ آرٹیفشل انٹیلی جینس کا پہلا پروگرام لکھا گیا جس کے ذریعے کمپیوٹر شطرنج کی بازی کھیل سکتا تھا۔ مگر ایک تو یہ سسٹم کافی سست تھا پھر یہ جو انسٹرکشنز لے سکتا تھا وہ بہت کم تھیں، 1980 میں جو کمپیوٹر ایجاد کیا گیا وہ 1951 کے کمپیوٹر سے 10 ملین ٹائمز زیادہ تیز تھا اور وقت کے ساتھ اس کی کپیسٹی بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ پھر ٹیلی کمیونیکیشن اور انٹرنیٹ نے انسان کے بہت سے خواب شرمندہ تعبیر کر دیے اور 20 سال سے کم عرصے میں آرٹیفشل انٹیلی جینس اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کی شاید 20 سے زیادہ تمام بڑی کمپنیاں اور دنیا کے تمام امیر ترین شخصیات نے اپنا پیسہ آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر میں ڈال دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل کر رہ گئی۔

سال 2000 سے ہی ہم آرٹیفشل انٹیلی جینس کی دنیا میں رہتے ہیں اور پچھلے 20 سال سے درجنوں کمپنیاں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہیں، ہم کمپیوٹر پر جو سافٹ ویئرز استعمال کرتے ہیں یا جو ہارڈ ویئر پلیٹ فارم استعمال کرتے ہیں، یا پھر جو موبائل استعمال کرتے ہیں ان سب کے ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر مکمل طور پر آرٹیفشل انٹیلی جینس کی ایک بڑی دنیا سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور پچھے 20 سال سے آرٹیفشل انٹیلی جینس ڈیٹا سینٹرز ہماری حرکات اور سکنات کو پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف ہیں۔

20 سال پہلے یہ ٹیکنالوجی آچکی تھی کہ آپ اپنے موبائل سے اپنے گھر کی تمام چیزیں اور اپنی دور دراز آفس کی تمام برقی چیزیں آن یا آف کر سکیں یا پھر انہیں پروگرام کر سکیں۔ ڈیجیٹل سوئچنگ کا کنسیپٹ نیا نہیں ہے۔ اسی طرح مینوفیکچرنگ سیکٹر میں آٹومیشن کا کنسپٹ بھی نیا نہیں ہے یہ سب کچھ ہم 20 سال پہلے کر چکے ہیں اور اس طرح کی سائنس کو اس وقت کے بچے بھی سمجھ چکے تھے۔ مگر اس سب کو عام کرنے میں ایک رکاوٹ تھی انٹرنٹ کی سپیڈ اور اس طرح کے آلات کی لاگت جس وجہ سے کہ عام عوام تک تو نہیں پہنچا مگر بہت سے بڑے دفاتر یا فیکٹریاں اسے پہلے سے ہی اچھی طرح استعمال کر رہی ہیں۔

ڈیجٹل آئی کا کنسپٹ بھی نیا نہیں ہے 20 سال پہلے سنائپر گنز کے ذریعے آر ایف آئی ڈی چیپ جو کہ کوٹیڈ ہوتی تھی جس سے دشمن کو یہ احساس ہی نہ ہو کہ اس کے جسم میں کوئی چیپ داخل ہوئی ہے اور وہ مچھر کے کاٹنے جیسی تکلیف سمجھ کر اسے بھول جائے اور پھر اس کی ٹریکنگ کی جاسکے، اس طرح کے تمام ٹرائل بھی کب کے ہو چکے۔

20 سال پہلے ہی کچھ کمپنیاں انگریزی سپیکنگ کے سافٹ ویئر بنا چکی تھیں اور اس طرح کے سافٹ ویئرز بھی بن چکے تھے جو انسان کی آواز کو سنیں اور اس پر رسپانس کریں۔ یہ انڈسٹری 20 سال پہلے ہی اپنے انویسٹرز کو اپنی طرف مدعو کر چکی ہے اور اس سیکٹرز میں اچھی خاصی سرمایا کاری بھی ہو چکی ہے اور اسی وجہ سے یہ کمپنیاں اپنے عروج پر ہیں۔

اوکے گوگل، بیکسبی، الیکسا، سیری ان تمام ناموں سے آپ واقف ہوں گے، ان میں سے اکثر ایپلیکیشن 35 سے زیادہ زبانوں میں اپنے آپ کو اپ ڈیٹ کر چکی ہیں اور نہ صرف انسانی زبانوں کی سیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں بلکہ انسان کے موڈ کو سمجھے کی بھی کوشش کر رہی ہیں کے ہم نارمل، یا پھر غصے میں یا پھر پیار میں کس طرح سے بات کرتے ہیں اور ہمیں کیا پسند ہے اور کیا نہیں پسند اور جانے کیا کیا۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس کا اگلا دور وائس کا ہے جس کے بعد آپ اپنے گھر کی ہر چیز سے بات کر سکیں گے، جیسے گھر کے افراد کے نام ہوتے ہیں اسی طرح گھر کی ہر چیز کے نام ہوں گے اور آپ ہر چیز کو اس کے یونیک نام سے بلائیں گے اور پھر اسے ہدایت دیں گے اور اس کے بعد ہر چیز آپ کی ہدایت کے مطابق کام کرے گی۔

ذرا سوچیں کہ آپ کے موڈ کے مطابق گھر کی سیٹنگ ہو جائے، یعنی کھڑکیاں اور دروازے بند ہو جائیں یا کھل جائیں، میوزک لگ جائے، لائٹس کم زیادہ ہو جائیں، اے سی، ہیٹر یا پنکھوں کی رفتار آپ کے مزاج کے مطابق ہو جائے، اور آپ کمرے سے باہر جائیں تو ہر چیز خود بخود آف ہو جائے۔ آج سائنس کے لیے یہ تمام باتیں انتہائی معمولی ہیں۔ اور لیبز میں کمپنیاں اس سب سے کہیں زیادہ ایجاد کر چکی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق آرٹیفشل انٹیلی جینس کی ایک ایک فیلڈ 3 سے 4 ٹریلین ڈالرز کا مارکیٹ سکوپ رکھتی ہے۔ اور وہ بھی 3 سے 5 سالوں میں۔

ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں آرٹیفشل انٹیلی جینس کی زیادہ تر کمپنیاں امریکہ میں ہیں اور دوسرے نمبر پر چین ہے اور تیسرے نمبر پر یورپ ہے۔ آرٹیفشل انٹیلی جینس مارکیٹ شئیر کے مطابق امریکہ 40 فیصد کے قریب ہے جب کہ چین 32 فیصد پر ہے اور یورپ تقریبا 22 فیصد پر ہے۔ 2019 کے مطابق چین نے 35 % نئی کمپنیاں خریدی ہیں اور امریکہ نے 27 فیصد نئی کمپنیاں خریدی ہیں جن کا تعلق آرٹیفشل انٹیلی جینس سے ہے اسی طرح 2019 میں امریکہ کی نسبت چین میں آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر میں کہیں زیادہ سرمایا کاری ہوئی ہے۔

چین کچھ وجوہات کی وجہ سے ایک بہتر مارکیٹ سمجھا جاتا ہے، ایک تو چین میں ہنر مند افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کی کاسٹ بھی دنیا کے باقی افراد کی نسبت ایک تہائی ہے، دوسری وجہ ہے وہاں پر پاور اینڈ انرجی جو دنیا کے کسی بھی ملک سے بہت سستی ہے اور تیسری وجہ ہے وہاں پر ایک مضبوط حکومت جس کے پیچھے عوام پوری طرح سے کھڑی ہے۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کی تمام بڑی کمپنیوں کے ایسٹ 20 بلین سے شروع ہو کر سینکڑوں بلینز تک ہیں اور ان تمام کمپنیوں کے نام آپ نے سن رکھے ہوں گے جیسے ایپل، ہواوے، مائکروسافٹ، سامسنگ، گوگل وغیرہ۔ امریکہ کی کئی کمپنیاں بہت پہلے سے ہی چین میں بین ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ وہ آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کی بڑی کمپنیاں ہیں اور دوسری طرف درجنوں چین کی آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کی کمپنیاں امریکہ میں بھی بین ہیں جین میں موبائل، ٹیلی کام، سرویلینس، سافٹوئیر، آن لائن سوشل میڈیا ایپس وغیرہ شامل ہیں۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کا معاملہ 20 سالہ جدو جہد کے بعد ایک فیصلہ کن مراحلے میں شامل ہو چکا ہے اور جو جیتا وہی سکندر۔

کرونا، جہاں تک سائنس کہتی ہے ایک قدرتی وبا ہے اور اس کی کسی لیب سے لیک ہونا ابھی تک ثابت نہیں ہوا مگر اسی امتحان سے اس بات کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ کون کتنا تیار ہے اور اسی کے پس پردہ جہاں بڑی بری کمپنیوں کو بہت نقصان ہو گا وہی بہت سے کمپنیاں اس تیاری میں بھی ہیں کہ اگلی حکمرانی کن کے پاس ہو گی۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کے استعمال سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے، ہماری نوجوان نسل، بیوروکریسی، حکومت، آرمی اور خفیہ اداروں کو چاہیے کہ اس سیکٹر میں اپنا کردار ادا کریں۔ جو لوگ آرٹیفشل انٹیلی جینس کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے انہیں اگلا دور قبول نہیں کرے گا۔ ہمارے پڑھنے اور لکھنے والے نوجوانوں کو چاہیے کہ نہ خود ڈریں اور نہ کسی اور کو ڈرائیں، بلکہ قدم بڑھائیں اور اس آنے والے دور میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔

جو لوگ آئی ٹی کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انہیں آئی ٹی سیکٹر نے گذشتہ 20 سالوں میں کہاں سے کہاں لا کھڑا کیا ہے۔ اگلا دوران کے لیے جیٹ پیک کا کردار ادا کرے گا۔ جو جتنی تیزی سے اس میدان میں آگے آئے گا مستقبل اسی کا ہے۔

ڈیجیٹل پاکستان حکومت کا ایک اچھا قدم ہے حکومت کو اس طرح کے بہت سے اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے، جن ملکوں میں 5 جی پہلے جائے گی وہ بہت تیزی سے آگے نکل جائیں گے، کہتے ہیں جو ڈر گیا وہ مر گیا، شاید اسی لیے ڈرایا جا رہا ہے کہ جو ڈرتے ہیں وہ اس دوڑ سے پیچھے ہٹ جائیں۔ کیوں کہ اگلا دور ڈرنے والوں کا بالکل بھی نہیں ہے۔

پاکستان میں جن کمپنیوں نے ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا ہے، آج لوگ صرف انہیں کو جانتے ہیں، کیوں کہ یہی وقت سے ہم آہنگ ہیں۔ آرٹیفشل انٹیلی جینس تقریباً ہر شعبے میں انقلاب برپا کر دے گی۔ آج کیا آپ سوچ سکتے ہیں ایک چھوٹا سا کاروبار بھی بغیر کمپیوٹر، موبائل اور انٹرنیٹ کے چل سکتا ہے۔ ہر گز نہیں تو پھر بڑے بڑے کاروبار کیسے ہوں گے۔ جو ٹیکنالوجی کی رفتار سے نہیں چلے گا وہ کبھی منزل تک نہیں پہنچے گا۔ آگے بڑھنا ہے تو پھر آگے صرف آرٹیفشل انٹیلی جینس ہی ہے۔

اللہ تعالی ہمارے علم میں اضافہ کرے، کاش حکومت ہمارے آئی ٹی سیکٹر کی سرپرستی کرے اور دنیا کی 100 فیوچرسٹک کمپنیوں میں ایک پاکستان کی کمپنی بھی ہو۔آپ کی معلومات کے لیے آخری بات عرض کرتا چلوں کہ چین کے ایک کمپنی ہے علی بابا، آپ کو معلوم ہے یہ صرف ایک کمپنی کتنا کماتی ہے، پاکستان بنگلہ دیش اور انڈیا کی کل کمائی سے بھی زیادہ کماتی ہے۔اپنے آپ سے سوال کریں، ہمیں ڈرنا ہے یا بڑھنا ہے۔

آئینہء خودی

تحریر: میاں وقارالاسلام

خودی ایک ایسا آئینہ ہے جو انسان کے بناوٹی چہرے کو اُتار پھینکتا ہے۔ وہی بناوٹی چہرہ جو انسان کے ہر جھوٹ کو سہارا دیتا اور اس کے غلط کو صحیح کر کے دیکھاتا رہتا ہے۔ معاشرے کے باطل پہلوؤں میں جینے کے لیے ہمیں ایسے ہی بناوٹی چہرے کی کمزور بیساکھیاں اُٹھانی پڑتی ہیں تاکہ ہم بھی انہیں معذور اور لاغر لوگوں میں شامل ہو جائیں جنہوں نے اپنی اپنی معذوریاں اکھٹی کر کے ایک کمزور اور ناتواں معاشرہ تشکیل دیا ہے۔ ایسے معاشرے چاہیے سینکڑوں کی تعداد میں ہوں یا پھر لاکھوں کی تعداد میں ان کی حیثیت دھول مٹی کی طرح ہی ہوتی ہے۔ ایسے کمزور معاشروں کی نہ تو کوئی طاقت ہوتی ہے اور نہ ہی کہیں کوئی وقعت۔ گردشِ دوراں کے کی سی ہوا انہیں اُڑا کر ساتھ لے جاتی ہے یا پھر ہلکی سی بارش بھی ان کا وجود دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ باظاہر جھوٹا انسان بڑا مضبوط اور طاقت ور نظر آتا ہے مگر اس میں ایسی سکت کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ حق اور سچ کے سامنے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔

آئینہء خودی میں جب انسان اپنا عکس دیکھتا ہے تو اس پر اُس کا اصل ظاہر ہونے لگتا ہے نہ صرف وہ اپنی کمزوریوں کا احاطہ کرنے لگتا ہے بلکہ اپنے مضبوط پہلوؤں کا بھی خوب جائزہ لیتا ہے۔ آئینہء خودی انسان پر نہ صرف اس کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا چلا جاتا ہے بلکہ اسے اپنے بنانے والے کی طاقت اور اس کی کاریگری کے راز بھی کھولتا چلا جاتا ہے۔ جوں جوں انسان اپنی تسخیر کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس میں دنیا کو مسخر کرنے کی طاقت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حق جب انسان کے اندر سرائیت کر جاتا ہے تو پھر اسے کسی جھوٹے بناوٹی چہرے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان کا عمل، انسان کی محنت اور اس کی تحقیق اس کا اپنا آپ منوانے لگتی ہے۔ غاروں میں رہنے والا انسان بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگتا ہے، گھوڑوں اور اُنٹوں پر سفر کرنے والا انسان بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرنے لگتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ انسان زمین اور سمندر کے راز پانے کے ساتھ ساتھ دوسرے سیاروں کو مسخر نے کی صلاحیت بھی پا لیتا ہے۔

آج اللہ کی یہ ادنا سی تخلیق پوری کائنات میں اپنے آپ کو منواتی آ رہی ہے اور لا ممکنات کا سفر بھی ممکنات میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے آج کا انسان بہت سی ایسی چیزیں وجود میں لا چکا ہے جن کے بارے میں کل کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف تو یہ انسان ہے جس نے ترقی کا سفر جاری رکھا اور اپنے رب کے پوشیدہ رازوں کے قریب پہنچ گیا اور مزید راز پانے کی جستجو میں آگے سے آگے نکلتا جا رہا ہے۔ یہ مضبوط اور طاقت ور انسان ہے جس کی حقیقت اس کے اپنے آپ کو خود منوا رہی ہے۔ اور دوسری طرف وہ انسان ہے جو اپنے لیے صرف دھوکے کا سامان پیدا کر رہا ہے۔

اسے ابھی پتا ہی نہیں کے اللہ نے اس کے اندر کتنے گہرے راز محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ تمام عمری جھوٹی اور مصنوعی زندگی گزارتے ہیں اور آخر کار ناامیدی کی موت مر جاتے ہیں۔ ان کے نہ تو جینے سے کسی کو کچھ فائیدہ ہوا اور نہ ہی ان کے مرنے سے کسی کو کوئی فرق پڑے گا۔ کیوں کہ انہوں کبھی اپنا آپ دیکھا ہی نہیں اور اگر کچھ دیکھا ہے تو وہ ہے صرف ناامیدی۔

جب تک اپنا آپ نہ بدلا جائے اور اپنے آپ کو اپنی بناوٹی ذات سے باہر نہ لایا جائے کسی قسم کی تبدلی ممکن نہیں۔ اپنا آپ بدلنے کے لیے انسان کو اپنے اندر جھانکنا پڑتا ہے اپن ذات میں اترنا پڑتا ہے اور اس ذات کو پہچاننا پڑتا ہے جس نے اُسے اشرف المخلوقات بنایا اور اسے ہر تخلیق پر فوقیت دی۔ انسان چاہے تو آئینہ خودی میں وہ تمام شرف ڈھونڈ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیے ہیں۔

آئینے پر داغ

تحریر: میاں وقارالاسلام

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر آپ صاف شفاف آئینے پر نظر دوڑائیں تو آپ کی نظر اس پر لگے ہوئے داغ کی طرف ضرور جائے گی اور پورا آئینہ آپ کے فوکس سے جاتا رہے گا۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور ہمیں اکثر اس بات کا سامنا ہوتا رہتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں صحافت بہت بری لگتی ہے۔ شاید یہ بھی ایک آئینہ پر داغ کی مانند ہے۔ اگر آپ ایک اچھے صحافی ہیں اور آپ کا تعلق اچھے صحافیوں تک رہتا ہے تو ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب آپ اپنے ارد گرد اچھے صحافیوں کا ایک حلقہ دیکھیں گے حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے صحافی اچھے نہیں ہوتے مگر آپ کو اس سے کیا لینا آپ کی صحافت اور آپ کا حلقہ احباب تو اچھے صحافیوں کا ہی ہے۔ مطلب یہ کہ ناامیدی والی بھی ایسی کوئی بات نہیں جہاں برائی ہے وہاں اچھائی بھی ہے اور برائی سے الگ تھلگ اور نمایاں بھی۔ آپ برے صحافیوں میں رہتے ہوئے بھی اپنی برادری کے بھائی بندوں جیسے نہیں آپ جیسے تھے آپ ویسے رہے اور ویسے ہی آپ کے دوست بھی بنے۔ یعنی صرف آپ اچھے نہیں آپ کے ارد گرد اور بھی بہت سارے لوگ اچھے ہیں۔

یہی معاملہ دوسرے قلم کاروں کے ساتھ ساتھ دوسرے پروفیشنز جیسے کہ اساتذہ، وکلاء، ڈاکٹرز اور شاید ہر طرح کے جائز کام کرنے والے لوگوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مطلب پروفیشنز برے نہیں ہوتے لوگ اچھے یا برے ہر پروفیشن میں ہوتے ہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ برائی ہی زیادہ کیوں نظر آتی ہے اور ہماری نظر اچھائیوں کی طرف کیوں نہیں جاتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ارد گرد بہت سے لوگ اپنے پروفیشن میں ایسے جان مارتے ہیں جیسا کہ جان مارنے کا حق ہوتا ہے، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انہیں بہت سے مسائل اور مشکلات کا سامنا بھی ہوتا ہے مگر وہ اپنے کام پر فوکس رہتے ہیں اپنے حصے کا کام کرتے جاتے ہیں اور صبر کیئے رہتے ہیں اور شکر کرتے رہتے ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہت بڑے سٹیٹس اور بہت زیادہ وسائل کے باوجود بھی لوگ بے چین رہتے ہیں اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ محدود وسائل اور محدود اختیارات کے باوجود بھی لوگ خوش رہتے ہیں۔

سکون کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا آپ کے قدموں میں ہو اور آپ کی خواہشات ایک کے بعد ایک پوری ہوتی رہیں اور پھر آپ اپنی خواہشات میں دھنس کر مر جائیں پھر آپ کو کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

دنیا بہت اچھی اور خوبصورت ہے اگر ہم اس میں اچھائی اور خوبصورتی دیکھنا چاہیں۔ دنیا بہت بری اور بدصورت ہے اگر ہم صرف برائی اور بدصورتی پر ہی بات کرتے رہیں۔

یہ دنیا اللہ کی طرف سے ایک مہمان خانہ ہے جس میں ہماری ضرورت سے کہیں زیادہ کچھ ہے۔ اگر ہم شمار کرنا چاہیں تو شمار بھی نہیں کر سکتے پھر بھی ہم خوش اور مطمئین کیوں نہیں پھر بھی ہمارے شکوے اور گلے کیوں ختم نہیں ہوتے۔

اگر دنیا میں اچھائی اور برائی برابر نہ رکھی جاتی تو حق اور باطل کا کھیل ہی ختم ہو جاتا، سب سچے ہوتے کوئی جھوٹا نہ ہوتا۔ مگر دنیا ایسی بالکل بھی نہیں ہے یہ دنیا ایک حکمت کے تحت بنائی گئی ہے۔ اور ہم شاید اس حکمت کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔

یہ دنیا ایک آئینہ کی مانند ہے ہم اس آئینے میں اچھا کریں گے تو یہ آئینہ ہمیں کبھی برا عکس نہیں دیکھائے گا ہم جب بھی اس میں دیکھیں گے اپنی اچھائیوں کو ہی پائیں گے اور ہمارا دل ہمیشہ اطمینان میں رہے گا۔ اور اگر ہم برائی ہی کرتے رہیں گے تو ہمارے اعمال بد کی تصویر اس میں ضرور بنے گی۔

اگر ہماری آنکھوں پر پردے ہیں اور کانوں میں ثقل ہیں تو کوئی بات نہیں یہ زندگی اتنی بھی لمبی نہیں ہے کہ ختم نہ ہو۔ پھر جس کی طرف ہم نے لوٹ کر جانا ہے اس کے پاس تو ہمارا حساب کتاب ہے ہی کہ ہم نے اس دنیا کے آئینے میں کیسا عکس بنایا ہے۔

ایک تجربہ کریں

اپنے سب سے اچھے دوست میں خامیاں تلاش کرتے رہیں اور اس کی خامیوں کا اظہار بھی کرتے رہیں۔ دیکھیں کہ وہ دوست کب تک آپ کا سب سے اچھا دوست رہتا ہے۔

یا پھر ایسا کریں کہ اپنے سب سے بڑے دشمن کی اچھائیوں پر غور کرنا شروع کر دیں اور اس کا اظہار بھی کرتے رہیں دیکھیں وہ کب تک آپ کا سب سے بڑا دشمن رہتا ہے۔

ممکن ہے کہ نتائج یکسو بدل جائیں

براتو ہمارے ارد گرد بہت ہو رہا ہے، کوشش کریں کچھ اچھا کریں

دعا گو

نئی نسل نیا دور

تحریر : میاں وقارالاسلام

اکثر یہ سننے کو ملتا ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کے لیئے کچھ کریں ان کے لیئے تعلیم اور روزگار کے مواقع پیدا کریں انہیں ایک بہترین ماحول فراہم کریں انہیں اپنی بہترین سماجی اور اخلاقی قدریں فراہم کریں اور انہیں ان برائیوں سے یا ان برے تجربات سے بچائیں جن کا ہمیں سامنا ہوا۔

ہم جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں اور ہماری سوچوں سے بالکل الگ تھلک ایک نئی دنیا تشکیل پا جاتی ہے اور ہم بہت جلد آوٹ ڈیٹیڈ ہو جاتے ہیں۔

ہر نئی آنے والی نسل اپنا ایک نیا دور لے کر آتی ہے۔ نئی نسل کے لیئے اللہ نے پہلے سے ہی روزگار کے مواقع پیدا کر چھوڑے ہیں۔ نئی نسل کا علم بھی ہم سے زیادہ ہے اور ترقی کی رفتار بھی ہم سے کہیں زیادہ ہے۔

صرف ہم 20 سال پہلے کے منظر کو دہرائیں تو شاید جو زندگی ہم گزار آئے ہیں ہمیں ویسا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہمارے دور کے لوگوں نے جو چیز بڑی محنت سے بنائی تھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اثار قدیمہ کا منظر پیش کر رہی ہے۔

بہت پرانی بات نہیں جب امریکہ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کو عروج ملا تو پچاس سے ساٹھ سال کے لوگوں دوبارہ کالجز میں بھیجا گیا اور انہیں آوٹ ڈیٹ ہونے سے بچانے کے لیئے اپ ڈیٹ کیا گیا تاکہ وہ آئی ٹی کے دور میں اپنا سروائول ڈھونڈ سکیں۔

آج سے صرف 10 سال پہلے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا مقام تھا اب یوں لگتا ہے جیسے 100 سال پرانی بات ہو۔ ہمارے ارد گرد کی دنیا یکسر بدل چکی ہو اور آج جو لوگ 50 یا 60 سال کی عمر میں ہیں اور اپنے وقت سے ہم آہنگ نہیں وقت ان کے لیئے پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں لا رہا۔

ہمارے سینئرز کے پاس بہت زیادہ تجربہ ہے اور علم بھی ہے مگر وہ اپنے علم کو اور تجربے کو شئیر ہی نہیں کر سکتے اگر وہ وقت کی ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو آپ ڈیٹ نہیں کرتے اور ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے دور حاضر کے لوگوں تک اپنا پیغام نہیں پہنچا سکتے

نئی جینریشن تو اپنے لیئے بہت کچھ کر لے گی بجائے یہ فکر کرنے کے کہ نئی جینریشن کا کیا بنے گا انہیں چاہیئے کہ خود کو ضائع ہونے سے بچائیں خود پر محنت کریں دور حاضر کا علم حاصل کریں اور دور حاضر کے لوگوں سے کمیونیکیٹ کریں اور اپنے علم اور تجربہ کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ تاکہ اس کا فائدہ ان کی میت نہ اٹھائے بلکہ آج کی نئی جنریشن ان کے علم سے مستفید ہو۔

ہمیں جو علم ملتا ہے یہ صرف ہماری ذاتی کاوش نہیں بلکہ اللہ ہمیں تیار کرتا ہے کہ ہم جو سیکھیں اس کا فائدہ آگے آنے والے لوگوں کو پہنچائیں مگر انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے اکثر تجربہ کار لوگ اپنا تجربہ اور اپنا علم اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں اور اس کا فائدہ کسی کو نہیں پہنچ پاتا جس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ وہ جس دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہ ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور پھر ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہتا یہاں تک کہ جینے کی مہلت بھی۔

اس سے پہلے کہ سب ضائع ہو جائے، اپنے علم کو محفوظ کریں اور نئی نسل اور نئے دور سے ہم آہنگ ہوں۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

بیسٹ لائف نوٹس سے زریں ملفوظاتِ حیات تک

تحریر: میاں وقارالاسلام

بیسٹ لائف نوٹس کے نام سے میری ایک پبلیکیشن سیریس ہے جس کے 10 والیمز یا جلدیں مکمل ہو چکی ہیں جو ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں اور اس سیریز میں ایک سو سے زیادہ لکھنے والوں نے اپنا حصہ ڈالا ہے اور اپنی تحریروں اور عمدہ انتخاب سے بیسٹ لائف نوٹس کو چار چاند لگائے ہیں۔ بیسٹ لائف نوٹس میری زندگی کا وہ اثاثہ ہے جو مجھے ان لوگوں سے ملا جنھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی چاہے وہ میرے والدین اور قریبی رشتہ دار تھے، چاہے وہ میرے ٹیچرز اور کلاس فیلوز تھے یا پھر وہ میرے باس یا پروفیشنل کولیگز تھے یا کہ ادب کی دنیا کے کچھ چمکتے ستارے۔ جہاں جہاں سے زندگی کو رہنمائی ملی وہاں وہاں سے بیسٹ لائف نوٹس نے روشنیاں سمیٹیں اور ایک بہترین یاداشت کو جنم دیا جو بیسٹ لائف نوٹس کے نام سے محفوظ ہے اور لاکھوں لوگوں کی نظر سے گزر چکی ہے۔

ایک کتاب جس کا 80 فیصد حصہ اردو پر مشتمل ہے اس کا عنوان انگریزی زبان سے کیوں لیا گیا یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میں ابھی تک تلاش کر رہا ہوں۔ میں اس کا جواب تو نہیں ڈھونڈ سکا مگر اپنے فیصلے کو سپوٹ کرنے کے لیے بہت کچھ کہتا رہا۔ حقیقت یہی تھی کہ میں اس عنوان کو بدلنا ہی نہیں چاہتا تھا کیوں کہ انگریزی کے تین لفظوں کی جگہ مجھے اردو کے تین متبادل الفاظ متاثر ہی نہیں کر سکے۔ جس کی بنیادی وجہ شائید یہ تھی کہ میں نے انگریزی زبان میں تعلیم لی اور جو بھی نئے مضامین پڑھنے کا موقع تعلیمی کا کاروباری میدان میں ملا ان کا براہ راست تعلق انگریزی زبان سے ہی تھا۔

آج کل انڈیا کے ایک چینل پر اپنی زبان کے حوالے سے ایک ویڈیو کلپ مشہور ہو رہا ہے جس میں ایک لڑکی اپنی مقامی زبان سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پوائینٹ آف ویو کو سامنے لانے کی کوشش کرتی ہے۔ لڑکی سکول سے واپس آتی ہے اور انگریزی زبان کے پیپر کا نتیجہ اپنی والدہ کو دیکھاتی ہے جس میں اس کے نمبر حیران کن حد تک کم آتے ہیں تو والدہ اس سے پوچھتی ہے کہ امتحان میں کیا پوچھا گیا تو وہ بتاتی ہے کہ انگریزی میں اپنے خوابوں کے بارے میں ایک مضمون لکھنا تھا تو میں نے سوال ہی چھوڑ دیا تو والدہ اسے کہتی ہے کہ تمہیں تو یہ سب لکھنا آتا تھا پھر تم نے کچھ لکھا کیوں نہیں۔ تو اس پر لڑکی بڑی معصومیت سے جواب دیتی ہے کہ ماں کیا ہم اپنے خواب بھی اپنی زبان میں نہیں لکھ سکتے۔ کیوں کہ کوئی بھی خواب مجھے کبھی انگریزی میں نہیں آیا بلکہ اپنی ہی زبان میں آیا ہے تو میں اپنے احساسات، جذبات اور خوابوں کا اظہار انگریزی میں کیوں کروں۔ یہ کلپ تو یہیں ختم ہو جاتا ہے مگر کئی سوال جنم دے جاتا ہے کہ آخر ہم جا کس طرف رہے ہیں۔

شاید اس لڑکی کو اس بات کا احساس بہت جلد ہو گیا کہ اپنے خوابوں کے اپنی ہی زبان میں لکھنا چاہیے مگر مجھے یہ احساس تب ہوا جب میں اپنے سارے خوابوں کو انگریزی زبان میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔

بہترین زندگی کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ہم نے انہیں انگریزی میں ہی سیکھا جیسے کہ موٹیویشن، انسپائیر شن، کمٹمنٹ، ہارڈ ورک، لانگ ٹرم ریلیشن شپ، آنیسٹی، آنر، ڈسیپلن، ٹائم مینیجمنٹ، سیلف لیس نیس، فیوچر یسٹک اپروچ، سوفٹ سکیلز اور جانے کیا کیا۔ یہ تمام ایسے کنسیپٹ نہیں ہیں جنہیں اردو میں لکھا پڑھا اور سمجھا یا نہ جا سکے۔ ہم ان الفاظ کو پہن تو لیتے ہیں مگر کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ یہ کنسیپٹ ہماری شخصیت پر اسی طرح ہی اثر انداز ہوں جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے۔ وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہم اپنے خواب بھی دوسری زبانوں میں دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

اپنی زبان سے دوری کی وجہ سے مجھے بیسٹ لائف نوٹس ایک بہترین عنوان لگا اور مجھے یہ لگا کہ اگر اس لفظ کو متعارف کروایا جائے گا تو عام پڑھنے والے اس کے مفہوم کو زیادہ آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ اور ہوا بھی کچھ ایسے ہی کہ مجھے اپنی بات سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اور تصنیف مکمل ہو گئی۔

دوسری طرف مجھے اردو زبان کے ایسے الفاظ کی تلاش رہی جنہیں میں بیسٹ لائف نوٹس کا متبادل رُخ دے سکتا۔ اسی ٹاپک پر کئی دفعہ ڈاکٹر سلطان محمود سے بات ہوتی رہتی تھی، وہ مجھے میرے ہر کام پہ ہمیشہ سپوٹ کرتے چلے آ رہے تھے مگر جب بیسٹ لائف نوٹس کا لفظ میرے منہ سے نکلتا تو وہ وہیں رک جاتے کیوں کہ یہ لفظ انہیں ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میں یہ کہ کر ٹال دیتا کہ بیسٹ لائف نوٹس کا ایک حصہ انگریزی زبان میں بھی ہے اور اسی طرح کے اور کمزور دلائل مگر انہیں نے کبھی اس بات کو سپوٹ نہیں، آخر میں یہ بات یہاں ختم ہوتی کہ ڈاکٹر سلطان صاحب جس دن مجھے آپ اس کا متبادل لفظ دیں گے جس سے میری تسلی ہو تو میں اس پر ضرور سوچوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سے عنوان تجویز کئے مگر مجھے وہ لفظ چاہیے تھا جواب عام فہم نہ رہا ہو مگر ہو اردو زبان کا تاکہ میں بھی کچھ ثابت کر سکوں کہ عام فہم انگریزی غیر فہم اردو عنوان سے بہتر تھی۔ سو یہ تجسّس کا سلسلہ جاری رہا۔

گذشتہ دنوں میں نے ڈاکٹر سلطان صاحب کا ایک لفظ پکڑ لیا جو شاید وہ روانی میں کہہ گئے وہ لفظ تھا " ملفوظاتِ عمری" جسے مذید ریفائن کر کے اور دوستوں کے مشورے سے "زریں ملفوظاتِ عمری" کے عنوان سے محفوظ کر لیا گیا۔ اگر دیکھا جائے یہ عنوان کسی بھی صورت بیسٹ لائف نوٹس سے

کم نہیں مگر کیوں کہ یہ عام فہم نہیں اس لیے اس لفظ کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئ ہے۔اور یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی گئ ہے کہ کسی طرح اردو زبان کے خوبصورت الفاظ وفات پا رہے ہیں۔

جب یہ عنوان فائنل ہو گیا تو میں نے بھی ایک شرط رکھی کہ ڈاکٹر صاحب کچھ تبدیلی آپ بھی لائیں وہ یہ کہ آپ کے آفس میں تمام ملازمین کے پروفیشنل سٹیٹس انگریزی زبان میں ہیں جیسا کہ مارکیٹنگ مینجر، سیسز اینڈ آپریشنل سٹاف، انوائیر مینٹل ایسٹس، ریسرچرز اور کنسلٹینٹ، کمپیوٹر آپریٹر، ڈیزائنز اور پرسنل سیکریٹری اور ہاں اپنا ٹائٹل بھی بدلیں مینیجنگ ڈائیر کٹر کی جگہ کوئی اور مناسب عنوان۔

مجھے یقین ہے کہ جتنا عرصہ مجھے بیسٹ لائف نوٹس کے متبادل عنوان تلاش کرنے میں لگا ہے اتنا ہی عرصہ ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کو اپنے کمپنی کے ملازمین کے نئے پروفیشنل سٹیٹس تلاش کرنے میں لگ جائے گا۔اور اگر انہوں نے سٹیٹس تبدیل کر بھی دیئے تو جب یہ سٹاف فیلڈ میں جائے گا تو کیا یہ اپنی نئ پہچان کروا پائے گا

ہم اردو سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کے سب کچھ اردو زبان میں پوری اپنائیت سے تبدیل ہو جائے تو کیا ہم اس تبدیلی کے لیے تیار بھی ہیں۔ کیا ایسا نہیں کہ آج کی اردو 50 سال پہلے کی اردو سے بہت زیادہ کمزور ہے۔ ہمیں تو پھر بھی ٹوٹی پھوٹی اردو آتی ہے کیوں کہ ہم نے میٹرک نہیں تو مڈل تک تو اردو ضرور پڑھی ہو گی۔ مگر ہماری اگلی آنے والی جنریشن جس کا آغاز ہی انگلش میڈیم سے ہوتا ہے وہ اردو زبان کو کتنا وقت دے پائے گی ۔آج اکثر گھروں میں اردو کا اخبار آتا ہے تو گھر کے بچے اسے پڑھ بھی نہیں سکتے ہاں اگر کچھ بزرگ باقی ہیں تو وہ شوق سے پڑھ لیتے ہیں۔ کیا اردو کو صرف ہمارے بزرگوں نے بچانا ہے یا اس سلسلے میں باقی لوگوں کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔کاش قوم اپنی قومی زبان کے ساتھ انصاف کر سکے۔ خدا جانے اردو زبان کا سکہ کب رائج الوقت ہو گا

دعا گو

میاں وقار الاسلام

مدر لینگو یج فرسٹ

ماں بولی زبان پہلے

تحریر: میاں وقارالاسلام

کہتے ہیں کہ ماں کی گود انسان کی پہلی درس گاہ، پہلا سکول، پہلا کالج اور پہلی یونیورسٹی ہوتی ہے۔

انسان کی شخصیت کا سوشل فیبرک، یا انسان کی شخصیت کا بنیادی ڈھانچہ ماں کی گود میں ہی تشکیل دے جاتا ہے۔

ہر زبان کا اپنا ایک ووکل سٹرکچر ہوتا ہے اسی طرح جو زبان ماں بولتی اس کا بھی ایک ووکل سٹرکچر ہوتا جو انسان براہ راست اپنی ماں سے سیکھتا ہے۔

بہت کم ایسا ممکن ہوتا ہے کہ انسان اپنی ماں بولی زبان جیسا ووکل سٹرکچر دوبارہ کسی دوسری زبان کا سیکھ پائے حالانکہ انسان بہت سی زبانوں میں کمال حاصل کر لیتے ہیں۔

شعور کے نام پر ہمیں کیسی جہالت پلائی جا رہی ہے کہ چاند پر پہنچنے کے خواب میں ماں کے چاند کو اپنی ماں بولی زبان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

غیر ملکی کمپنیاں جب ہمارے دیہی علاقوں میں اپنی مصنوعات بیچنے کے لیئے مارکیٹنگ کرتی ہیں تو اپنے اشتہارات مقامی زبانوں میں بنواتی ہیں تاکہ انہیں اپنی بات سمجھانے میں کم سے کم محنت کرنی پڑے۔

ہم اپنے ہی لوگوں کو وہ زبان سیکھاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی اپنی ہی باتیں ان کے والدین اور ان کے رشتے داروں اور ان کے علاقے کے لوگوں کو سمجھ میں نہ آئیں۔

دنیا کا کوئی جانور اپنی مادری زبان نہیں چھوڑتا اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان جانور بن جائے۔

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انسان بہت سی زبانوں پر عبور حاصل کر لیتا ہے۔

آج انسان نہ صرف مختلف زبانوں پر عبور حاصل کر چکا ہے بلکہ اپنی زبانیں جانوروں کو اور جانوروں کی زبانیں خود کو سمجھانے کے مراحل طے کر رہا ہے

بہت سی زبانیں سیکھنے کی غرض سے یا پھر ترقی کی خاطر یہ ضروری نہیں کہ انسان اپنی ماں بولی زبان کو ترک کر دے بلکہ اسے چاہیے کہ دوسری زبانوں پر عبور حاصل کر کے اس علم کے ذریعے اپنی زبان کو مضبوط کرے اور اپنے لوگوں کو آگے بڑھنے میں مدد کرے۔

نئی نئی زبانیں سیکھنے کہ چکر میں ہمیں اپنی قومی اور علاقائی زبانوں کا سودا ہر گز نہیں کرنا چاہیئے۔

جو بات اپنی زبان میں اپنے لوگوں کو سکھائی یا سمجھائی جا سکتی ہے وہ کسی اور زبان میں سمجھانا ممکن ہی نہیں۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ووٹ لینے کے لیے، ٹیکس لینے کے لیے اور ملکی و غیر ملکی مصنوعات کو بیچنے کے لیے یہاں تک کہ اپنے اپنے عقیدوں کے پرچار کے لیئے تو علاقی زبانوں کو یاد کر لیا جاتا ہے مگر اسی علاقائی زبان کو علاقے کی ترقی، فلاح، اصلاح، تعلیم، شعور، معاشی آگہی اور سماجی بیداری کے لیئے استعمال نہیں کیا جاتا۔

کسی بھی ملک کا ملٹی لنگوول ہونا اس کی پہچان ہوتا ہے اور زبانوں کے مارنے سے زبانیں ہی نہیں مرتیں لوگوں کی پہچان اور شناخت بھی مر جاتی ہے اور اس سے جڑے ہوئے تمام خواب بھی چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

خواب نہ رہیں تو انسان کوشش کس چیز کے لیے کرے گا۔ خواب زندہ رہنے چاہیں، خوابوں کے زندہ رہنے سے معاشرے زندہ رہتے ہیں، زبانوں کے زندہ رہنے سے ان زبانوں سے جڑے ہوئے معاشرے زندہ رہتے ہیں۔

کسی بھی علاقے میں مقامی لوگوں کے قدم مضبوط کرنے کے لیے ان کی مقامی زبانوں کا تحفظ اور ترویج بہت ضروری ہے۔ لوگوں پر اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں کہ ان سے ان کی پہچان چھین لی جائے یا پھر کمپرومائز کروالی جائے۔

ایسے بے زبان اور بے جان معاشرے جو اپنے نہیں رہیں گے۔۔۔ تو پھر وہ کسی کے نہیں رہیں گے۔ لوگوں کو اپنا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اپنی زبان واپس دی جائے۔ وہی زبان جو انہیں ان کی ماں کی گود سے بالکل مفت ملتی ہے اور اسے اضافی قیمت لے کر چھین لیا جاتا ہے۔

دعا گو

میاں وقار الاسلام

انگریزی سے پاک اردو

تحریر : میاں وقارالاسلام

آخر ہم اردو کی تحریر میں انگریزی کے الفاظ کیوں شامل کرتے ہیں۔ انگریزی سکولوں سے اردو قلم کاری کی طرف تشریف لانے والے اکثر میرے جیسے نئے لکھنے والوں کو یہ مسئلہ در پیش ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن کے مطابق عام فہم الفاظ کو اردو میں شامل کرکے اردو کو اور پیچیدہ کر دیتے ہیں۔

انگریزی کو اردو میں شامل کرنا انہیں کمزوری نہیں لگتا کیوں کہ عام فہم الفاظ جیسے ان کے ذہنوں میں ہوتے ویسے ہی پڑھنے والوں کے ذہن میں بھی ہوتے ہیں۔ تو جو غلطی لکھنے والا کر جاتا ہے وہی غلطی پڑھنے والا بھی کر جاتا ہے۔ مگر دونوں اطراف کی غلطیوں سے غلط بات ٹھیک نہیں ہو جاتی جو بات غلط ہے وہ غلط ہی رہے گی۔

اردو کو اگر انگریزی سے پاک کر دیا جائے اور عام فہم انگریزی کے الفاظ کو بھی اردو کی تحریر سے تلف کر دیا جائے تو اردو اور نکھر کر سامنے آئے گی۔

دراصل لکھنے کی روانی میں جب ہم کوئی بات مکمل کرنا چاہتے ہیں تو ایک دم سے انگریزی کا لفظ ٹپک پڑتا ہے اور ہماری بات مکمل ہو جاتی ہے مگر اس طرح سے بات کو مکمل کرنا ایک خلا چھوڑ جاتا ہے اور یہ خلا پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں جانتا کہ اس طرح کی انگریزی سے آلودہ رنگ برنگی اردو کس نے شروع کی اور پھر یہ ہم پر اتنی بری طرح سے اثر انداز ہوئی کہ جیسے ساری اردو کو دیمک ہی لگ گئی ہے۔

آج اگر ہم انگریزی کی دیمک سے پاک صاف صاف اردو لکھتے ہے تو ہمیں یہ ڈر رہتا ہے کہ شاید اسے پڑھنے والے اس میں دلچسپی نہیں لیں گے اس لیئے ہم کبھی اپنا الو سیدھا نہیں کرتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ الو کو کبھی سیدھا ہی نہ کیا جائے۔

ہم نے خود ہی انگریزی سے آلودہ رنگ بر نگی اردو ایجاد کی ہے جو ایک لت کی طرح لوگوں کو لگ چکی ہے۔ اگر انگریزی کے دو چار لفظ نہ مارے جائیں تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص پڑھا لکھا نہیں ہے۔

حال ہی میں ٹرمپ نے مودی کو چائے والا کہنے کی بجائے چیڑے والا یا پتا نہیں کیا کہہ دیا نہ اسے خود سمجھ آئی کہ اس نے کیا کہا ہے اور نہ سننت والوں کو سمجھ آئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے خود کو اردو جاننے والا بنانے کے چکر میں ٹرمپ خود بھی بدنام ہوا اور مودی کو بھی رسوا کیا اور زبان کی بھی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ یہ ہوتی ہے لسانی ملاوٹ اور لسانی گراوٹ۔

آخر پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لیئے کیا اردو میں انگریزی شامل کرکے اسے مسخ کرنے اور اس کی ٹانگ توڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

اگر ہماری اردو کمزور ہے تو اس میں بے چاری اردو کا کیا قصور ہیں ہمیں اپنی ادھوری اردو کو پورا کرنے کے لیئے انگریزی کی ملاوٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

کیا واقعی اردو اس بات کی محتاج ہے کہ اسے انگریزی سے سہارا دیا جائے۔۔۔ ہر گز نہیں۔۔ دراصل ہم اپنی کمزوریوں کو انگریزی زبان کے الفاظ شامل کرکے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح کی رنگ برنگی آلودہ اردو ہم بول بھی لیتے ہیں لکھ بھی لیتے ہیں اور پڑھ بھی لیتے ہیں اور شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔

کہتے ہیں کہ غلطیوں کا اعتراف کر لینے میں کبھی کوئی غلط نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک درست قدم ہے اور یہ قدم ہمیں اٹھانا چاہیئے ہو سکتا ہے کہ جس نے بھی اردو کو خراب کرنے کی رسم شروع کی تھا شاید اس رسم کا خاتمہ ہو۔

یقین مانیں میں نے اپنی بہت سی تحریروں کو انگریزی سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے، میں روانی میں پھر کبھی کبھی غلطی کر جاتا ہوں کیوں کہ میرے اندر کا خلا ابھی بھرا نہیں ہے مگر جب بھی میں اپنی کسی تحریر کو انگریزی سے پاک کرتا ہوں تو وہ مجھے انتہائی خوبصورت بھی لگتی اور متاثر بھی کرتی ہے اور میرے اندر کے خلا کو کم کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

محترم سلطان محمود صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح کی ملاوٹ کرنے والے قلم کار اردو کے قاتل ہیں اور وہ ٹھیک کہتے ہیں میں سے 100 فیصد متفق ہوں۔

اسی طرح محترمہ شہناز مزمل صاحبہ کہتی ہیں کہ اردو ایسی ہونی چاہیئے کہ اس پر کوئی اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔اس بات میں بھی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

ہمیں چاہیئے کو اردو کو اس کی اصل حالت میں برقرار رکھیں بجائے اس کے کہ اردو ہماری کمزوریوں کا شکار ہوتی رہے۔

اردو سے محبت کرنے والے سے اپنی معذوری پر معذرت کے ساتھ دعا گو ہوں کہ ہمارے قلم سے اردو کا وقار مزید مجروح نہ ہو اور نہ ہی ہماری زبان ہماری اردو کو انگریزی سے آلودہ کرے۔

دعا گو میاں وقارالاسلام

کیا اردو کی جان خطرے میں ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

آج سے تقریباً 30 سال پہلے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے والدین اور میرے خاندان کے بڑوں نے مجھے جس معیار کی اردو ورثے میں دی آج وہ ورثہ لٹ چکا ہے۔ آج جو اردو میں اپنے بچوں کو دے رہا ہوں یقیناً اس کا معیار دیکھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

جس معیار کی اردو ہمیں ورثے میں ملی تھی ہم نے اسے اپنے سینے سے نہیں لگایا اور نہ ہی اسے آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ہم نے جو تعلیم حاصل کی اور جو معیارِ زندگی اپنایا اس میں اردو کا کردار نہ ہونے کے برابر رہا۔ اور یہ معیار گرتے گرتے چورا چورا ہو گیا اور یہ چورا چورا آج ہمیں اپنے بچوں کی زبانوں پر ٹوٹی پھوٹی اردو کی شکل میں نظر آتا ہے۔

ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، ہمارے بچے جو ہمیں اپنی جان سے بھی عزیز ہیں ہم انہیں وہ ورثہ بھی نہیں لوٹا پائے جو ورثہ ہمیں ہمارے بڑوں نے دیا تھا۔ اردو کی جان خطرے میں ہے ہی، ساتھ ہی ہمارے بچوں کی پہچان بھی خطرے میں ہے۔ ہم کیسی نئ قوم چھوڑ کر جا رہے ہیں کہ ان کی چورا چورا اردو ہمیں تو کچھ کچھ سمجھ آتی ہے مگر ہمارے جو بزرگ آج زندہ ہیں، جو اردو کو اس کے اصل روپ میں پہچانتے ہیں ہمارے بچوں سے بات تک بھی نہیں کر سکتے۔

ہم دو نسلوں کے درمیاں کھڑی ایک عجیب نسل ہیں جس نے دادوں اور پوتوں کو ایک دوسرے سے اجنبی کر دیا ہے۔ ہم نے جدت کے نام پر ایک ایسا زہریلا بیج بو دیا ہے جس کی جنس بھی زہر آلودہ ہو گی۔ جو فاصلہ ہم نے پیدا کیا ہے آنے والے بچے شاید اس فاصلے کو اور زیادہ بڑھانے جا رہے ہیں ۔

ہمارے دادوں کو تو شاید ہمارے پوتوں کی اشاروں کی زبان سمجھ میں آتی ہو، مگر شاید ہمارے پوتے اتنے زیادہ جدت پسند ہوں کہ ہم ان کے اشارے بھی نہ سمجھ پائیں۔ نہ صرف اردو کی جان خطرے میں ہے بلکہ ہماری پہچان خطرے میں ہے۔

کیا ہم اتنے بے یار ومددگار ہو گئے ہیں کہ اپنی پہچان کی بقا کے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم نے جدت کے نام پر کس قدر جہالت کمائی ہے مجھے تو اس کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے۔ اور میں اسی شدت سے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح دم توڑتی اردو کی چند سانسیں ہی بحال کر دی جائیں۔

جو کینسر اردو کے اندر سرائیت کر چکا ہے اس کا علاج میرے بس کی بات نہیں اور نہ ہی یہ اتنا آسان ہے کہ اس کا ذمہ کسی فردِ واحد پر ڈال کر آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اردو کی جان بچانے کا ذمہ ہم سب کو مشترکہ طور پر اُٹھانا پڑے گا وہ کہتے ہیں نا ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ اردو کی جان خطرے میں ہیں

اپنی زبان کے لیے کچھ کیجئے

اپنی پہچان کے لیے کچھ کیجئے

پیپر بک اور ڈیجیٹل بک

تحریر : میاں وقارالاسلام

قلم اور کاغذ کا رشتہ بہت پرانا ہے، شروع شروع میں اخبارات، بینرز، پلے کارڈز، کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ جیسے جیسے ٹیکنالوجی نے ترقی کی قلم اور سیاہی ایک طرف رہ گئی اور پیپر پر ڈیجیٹل انک نے اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ آج شاید ہی کوئی اخبار اور کتاب ہو جو بغیر ڈیجیٹل پرنٹنگ کے مارکیٹ میں آتی ہے۔

دراصل جسے ہم ہارڈ نیوز پیپر یا ہارڈ پیپر بک کہتے ہیں اسے بھی سب سے پہلے ڈیجیٹل تیار کیا جاتا ہے اور تب ہی یہ ممکن ہو پاتا ہے کہ اسے پرنٹ کر کے مارکیٹ میں لایا جا سکے۔

ایک طرف قلم اور سیاہی کا رشتہ آج تاریخ کا حصہ ہے، دوسری طرف ڈیجیٹل بکس ترقی کرتے ہوئے ہماری سوچ سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ آج کی ڈیجیٹل بک صرف ڈیجیٹل بک ہی نہیں ہے بلکہ معلومات کا ایک وسیع سمندر ہے۔

آج ٹیکنالوجی نے ڈیجیٹل بک کو ایک نئی پہچان دے دی ہے، نہ صرف ڈیجیٹل بک کو موبائل، لیپ ٹاپ، ٹیب، یا پھر کمپیوٹر سکرین پر پڑھا جا سکتا ہے بلکہ سنا بھی جا سکتا ہے، اور نہ صرف سنا جا سکتا ہے بلکہ کسی بھی مضمون سے متعلقہ ویڈیوز، اور حوالہ جات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کسی بھی لفظ کے معانی اور اس کے وضاحتی نوٹس بھی ساتھ ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

تحقیق کرنے والے لوگوں کے لیے ڈیجیٹل بکس کی افادیت کے اتنا بڑھا دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی متعلقہ مضمون کی 2 ڈی اور 3 ڈی بھی دیکھ سکتے ہیں، ورچیول ٹوور بھی کر سکتے ہیں، زوم ان اور زوم آوٹ کر کے بہت ہائی کوالیٹی میں کسی بھی تصویر، پراڈکٹ یا آبجیکٹ کو مزید گہرائی میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ بات صرف یہاں تک نہیں رکتی بلکہ وہ ان معلومات کو بک مارک کر سکتے ہیں، کاپی کٹ اور پیسٹ کر سکتے ہیں اور مستقبل میں استعمال کرنے کے لیے محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔

بات صرف ڈیجیٹل بک تک محدود نہیں رہی، بلکہ کہیں آگے نکل چکی ہے، دنیا کے بڑے بڑے میوزیمز، اور لائبریریز کو ڈیجیٹل کیا جا چکا ہے۔ اور ڈیجیٹل بھی اس طرح سے کیا جا چکا ہے کہ آپ کہ آپ گھر بیٹھے تمام معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور وہ بھی اسی طرح کے جیسے آپ خود وہاں گھوم پھر رہے ہیں۔

یعنی آپ میوزیم کو موبائل یا کسی بھی انٹرنیٹ ڈیوائیس سے ایکسس کریں اور میوزیم کے مختلف حصوں تک رسائی حاصل کریں پھر کسی بھی حصے میں موجود تصاویرز یا ماڈلز وغیرہ کو فوکس کر کے دیکھ لیں، بات صرف دیکھنے تک محدود نہیں، آپ کسی بھی چیز کی مذید تفصیل حاصل کرنے کے لیے آڈیو، وڈیو اور دیگر حوالہ جات بھی لے سکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح آپ گھر بیٹھے پبلک لائبریری کو بھی ایکسس کر سکتے ہیں اس میں موجود کتابوں کو دیکھ سکتے ہیں اور مطلوبہ کتاب کو آن لائن پڑھ سکتے ہیں یا ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔

اسی طرح تعلیمی ادارے بھی اپنے طلبہ اور طالبات کے لیے اپنی اپنی لائبریریوں کو ڈیجیٹل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پاکستان میں بھی بہت سے ادارے یہ کام کر چکے ہیں، حکومت نے بھی بہت کچھ کیا ہے اور بہت کچھ ہو بھی رہا ہے۔ لمز یونیورسٹی، پنجاب یونیوسٹی، پنجاب ایجوکیشن بورڈ، ورچیول یونیورسٹی یا اس طرح کے درجنوں اور ادارے، یا پھر لیڈنگ سکول سسٹمز یہ سب بہت عرصے سے اپنی اپنی لائبریریوں کو ڈیجیٹل کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہیں اور ان کے طالبہ اور طالبات اپنی تعلیم کے حصول کے لیے ڈیجیٹل ریسورسس کا سہارا لیتے آ رہے ہیں۔ آج کے دور میں طلبہ اور طالبات کے لیے ڈیجیٹل بکس اور متعلقہ معلومات کو کمپوٹرائیز کئے بغیر کسی بھی تعلمی ادارے کا مزید سروائیو کرنا تقریبا ناممکن ہے۔

دنیا آج ڈیجٹل لائبریری پارکس جیسے منصوبوں پر کام کر رہی ہے، یعنی آپ کو سرسبز وشاداب پارکس میں چلتے پھرتے، ڈیجیٹل بکس کھڑی نظر آئیں گی، اور اپنی سکرین پر چلتے ہوئے الرٹس سے یہ بتا رہی ہوں گی کہ ان میں کس طرح کی اہم معلومات موجود ہیں اور آپ کو انہیں کیوں پڑھنا چاہیے۔ وہیں راستے میں کھڑے کھڑے آپ کتاب کے تبصرے پڑھ سکتے ہیں، اور پڑھنے والوں کے کمنٹس بھی دیکھ سکتے ہیں، اور بوتھ بکس پر لگے ہوئے کیو آر کوڈ کے ذریعے اپ ان کتابوں کو اپنے موبائل میں کھول سکتے ہیں اور، پبلک پرنٹنگ بوتھ سے آپ کسی بھی معلومات کا پرنٹ بھی حاصل کر سکتے ہیں، یا پھر مطلوبہ مواد اپنے موبائل میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔

جدید ترین ڈیجیٹل سکرین، فیوچر کی بات نہیں ہے بلکہ آپ بہت سے پبلک پارکس، شاپنگ مالز، اور روڈز کے کناروں یا مارکیٹس میں یہ سکرینیں بہت پہلے سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو گذشتہ کئی سال سے انہیں پاکستان میں بھی مینوفیکچر کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ ابھی بھی کچھ مہنگی ہیں مگر بڑے اور درمیانے درجے کے اداروں کی قوتِ خرید سے دور نہیں۔

آپ کے ہاتھ میں جو موبائل ہے وہ صرف موبائیل ہی نہیں ہے بلکہ دنیا جہاں کی کتابوں اور معلومات کا مجموعہ بھی ہے، نہ صرف آپ کتابیں پڑھ سکتے ہیں، بلکہ جس طرح کا مواد آپ کو پسند ہو یا جس مصنف کو آپ پڑھنا چاہیں، بغیر کسی خاص محنت کے یہ آپ کے لیے ممکن ہے، اپنے پسندیدہ مصنف کے پیجز، گروپس ویب سائیٹس، ویڈیو چینلز بھی دیکھ سکتے ہیں، اور نہ صرف انہیں براہ راست پیغام بھیج سکتے ہیں بلکہ ان کے پروگرامز کا حصہ بھی بن سکتے ہیں۔

پیپر بک آپ کو کیا دے سکتی ہے اور ڈیجیٹل بک آپ کو کیا دے سکتی ہے اس کا موازنہ کرنا آج کے دور میں بنتا ہی نہیں۔

ہم قران مجید کی ہی مثال لیتے ہیں، جو لوگ قران پڑھنا چاہتے ہیں، انہیں ڈیجٹل قران نے بہت کچھ فراہم کیا ہے، بہت سے سافٹ ویئرز موجود ہیں، خاص کرکے ایزی قران و حدیث جسے میں بہت عرصے پہلے استعمال کر چکا ہیں، مگر اس سے بھی بہتر ریسورسس موجود ہیں۔ یعنی آپ قران مجید کے 10 سے زیادہ تراجم اردو میں دیکھ سکتے ہیں اور انگریزی میں بھی، اس کے علاوہ احدیث کی تمام اہم کتابیں بھی ترجمے کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ پھر قران و احدیث کو مضامین کے حساب سے الگ الگ کیا ہوا ہے تو آپ کسی بھی مضمون کا انتخاب کریں اور متعقلہ آیات یا احدیث پڑھتے چلے ہیں۔ مزید یہ کہ آپ کسی بھی آیت اور حدیث کو مطلوبہ ترجمے اور مطلوبہ تفسیر کے ساتھ کاپی کرکے نوٹس بھی بنا سکتے ہیں۔ اور مزید یہ بھی کہ آپ کسی بھی ترجمے کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ اس کی تلاوت اور ترجمہ سن بھی سکتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ اپ عربی یا اردو یا انگریزی لفظ سے سرچ بھی کر سکتے ہیں۔

اس قدر آزادی، پیپر بک آپ کو فراہم کر پائے یہ بالکل ہی ناممکن سی بات ہے۔

پیپر بک تو دور کی بات، سب سے قیمتی پیپر کسی بھی ملک کی کرنسی ہے، اور آج پیپر کرنسی کو ختم کرنے کی بات موضوع بحث ہے اور چین تو ایک ہی سال میں کئی ٹریلین ڈالرز کی ٹرانزیکشن بغیر پیپر کرنسی کے کر چکا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ بہت جلد وہاں پیپر کرنسی کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہو جائے گا۔

اب لوگ پیپر بک کو یاد کر کر کے روتے ہیں تو کیا کیا جا سکتا ہے، حقیقت یہی ہے کہ آج پیپر بک کے بغیر تو معاشرہ چلایا جا سکتا ہے مگر ڈیجٹل بکس کے بغیر معاشرہ نہیں چلایا جا سکتا ہے۔ دنیا جس دوڑ میں ہم سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ بر حال ہمیں اسی دوڑ کا حصہ بننا ہے اب ہم کچھوے کی سپیڈ سے آہستہ آہستہ چلتے ہیں یا خر گوش کی سپیڈ سے دوڑتے ہوئے دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں یہ ہم پر ہی منحصر ہے۔

محبت میری نظر میں؟

تحریر: میاں وقارالاسلام

میری نظر میں محبت ایک قرض ہے اور اس قرض کی پوری قدر کرنی چاہیے۔ جہاں سے محبت نصیب ہو وہاں اسے کم از کم اس کی قدر کے مطابق واپس بھی لوٹانا چاہیے، حالانکہ محبتوں کے قرض پوری طرح اتارے نہیں جا سکتے۔ انسان کے پیدا ہونے سے پہلے محبت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ جس جوڑے سے محبت کرتا ہے اُسے اُن کی محبت کا اور اپنی محبت کا عظیم تحفہ عطا کرتا ہے۔ بچے دنیا میں آنے سے پہلے ہی ماں باپ کی آنکھوں کے تارے بن جاتے ہیں اور جانے کیا کیا خواب والدین ان بچوں کے لیے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر وہ ان خوابوں کی تکمیل کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں کون ہے جو رب کا احسان اتار سکے اور اپنے ماں باپ کا قرض اتار سکے۔ اسی طرح ہمارے اساتذہ اور ہمارے دوستوں کی محبت کا بھی ہم پر قرض رہتا ہے جو ہماری زندگی کو خوبصورت بھی بناتے ہیں اور با مقصد بھی۔ محبت کا قرض محبت سے ہی اتارا جا سکتا ہے، جیسی ہمیں جس جس سے محبت ملی ویسی ہی محبت ہمیں ان سب کو واپس بھی دینی چاہیے اور جو محبت معاشرے نے ہمیں دی وہی محبت ہمیں واپس اسی معاشرے کو بھی دینی چاہیے۔ اور اگر اللہ کا فضل ہمارے ساتھ نہ ہو تو ہمیں کچھ بھی نصیب نہ ہو، اللہ اپنے بندوں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے تو ہم سب سے زیادہ مقروض اس ہستی کے ہیں جس نے ہمیں تخلیق کیا سو ہمیں اپنے خالق کی محبت کا قرض اس سے اور اس کے لوگوں سے محبت کر کے اتارنا چاہیے۔

مضمون : پختہ رنگوں کی کہانیاں

تحریر : میاں وقارالاسلام

محترمہ فاخرہ پروین صاحب کی مضامین پر مبنی کتاب " جینے کا یہی طریقہ ہے" سے انتساب

زندگی چاہے کئی سو سال کی ہو، سو سال کی ہو، ستر سال کی ہو ساٹھ سال کی ہو یا پھر اس سے کم لگتا تو ایسے ہی ہے کہ جیسے پل بھر میں گزر گئی۔

انسان اپنی زندگی پر مختصر لکھنے بیٹھے تو چند ہی لائنوں میں قصہ تمام کیا جا سکتا ہے اور اگر تفصیل سے لکھنے بیٹھے تو بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی نظر میں اتنا لمبا افسانہ بن جاتے ہے کہ ختم کرتے کرتے عمر کم پڑ جاتی ہے۔

انسان ماں کی محبت میں لکھتا ہے تو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، باپ کی محبت میں لکھتا ہے تو الفاظ ہی نہیں ملتے جو ایسی بے پناہ محبتوں کے عکاس بن سکیں مگر پھر بھی لکھا جاتا ہے اور بہت لکھا جاتا ہے اور جتنا بھی لکھا جاتا ہے کم پڑ جاتا ہے۔

اسی طرح دوستوں اور رشتہ داروں اور قرابت والوں پر لکھا جاتا ہے، استادوں پر لکھا جاتا ہے، نئی اور پرانی نسلوں پر لکھا جاتا ہے۔ اور یہ سفر بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان اگر نظر دوڑائے تو پرندوں کی کہانیاں ختم نہیں ہوتیں جانوروں کے قصے ختم نہیں ہوتے، کیا جھیل کیا وادیاں، کیا دریا کیا سمندر کیا قدرتی نظارے، کیا زمین اور کیا آسمان نظر جہاں جہاں پڑھتی ہے کچھ نہ کچھ نکال لاتی ہے۔

اور اگر نظر کہیں نا بھی پڑے تو تخیل کی ایک وسیع دنیا پڑی ہے۔ انسان سوچوں میں کھو جائے تو اتنا دور نکلا جاتا ہے کہ پھر کسی کی آواز بھی اس تک نہیں پہنچی۔ سوچ ہی سوچ میں انسان آسمانوں کی حدوں سے نکل جاتا ہے، سمندر کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور قلم کار ایسی ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ اگر ان کی باتیں سونے کے قلم سے بھی لکھی جائیں تو بھی ان کی قیمت کا تخمینہ نہیں لگایا جاسکتا۔

اگر دیکھا جائے تو یہ انسان کا نہیں بلکہ رحمٰن کا ہی کمال ہے جس نے ایک ذرے کو اتنی اہمیت دے دی کہ وہ اشرف المخلوقات ہے گیا۔ خالق نے اس مخلوق کو ایسا بنایا ہے کہ یہ بہت کچھ تخلیق کرنے کی صلاحیوں سے مالا مال ہے۔

مگر یہ صلاحیوں سے مالا مال انسان اپنی وقت تب کھو دیتا ہے جب یہ اپنی ٹھیک ٹھیک پہچان نہیں کر پاتا، اتنی سی پہچان نہیں کر پاتا کہ اسے پیدا کیوں کیا گیا، اور اسے کس نے پیدا کیا، اس نے کرنا کیا ہے اور اس کا ہونا کیا ہے۔ دنیا سے جو زادِ راہ اکھٹا ہوگا اس کا کیا معاملہ ہوگا اور یہ کہ آخر کار اسے اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہونا ہے۔

کہانی ایک ہو یا ہزاروں، انجام اچھا ہو یا برا، لوگ تعریف کریں یا نہ کریں شاید فرق صرف ایک ہی چیز سے پڑھے گا کہ ہزاروں کہانیاں رکھنے والا یہ انسان اپنی زندگی کے اصلی کہانی کیسے لکھ کر آیا ہے۔ کیا اس کی زندگی کی اصلی کہانی اتنی دلچسپ اور حسین ہے کہ اس کی مغفرت کروا سکے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں جو رنگ بھرتے ہیں، ان رنگوں کی حقیقت اللہ کے ہاں کیا حیثیت رکھتی ہے ایسا نہ ہو کہ بے بہار نگوں سے سجی سجائی زندگی جب اپنا حساب دینے پر آئے تو اس کے سارے رنگ ہی اُڑ جائیں۔

اپنی زندگی کو خوبصورت بنائیں، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی مگر اسے پختہ رنگوں سے سجائیں تاکہ ان کا نکھار دنیا میں بھی رہے، آپ کے دنیا سے جانے کے بعد بھی رہے اور آپ ان رنگوں کے حساب کے دن بھی دیکھ کر خوش ہوتے رہیں۔

اللہ ہمیں توفیق دے، ہم اللہ کی دی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہو سکیں اور اپنی زندگیوں کی کہانیاں ایسے پختہ رنگوں سے لکھیں کہ یہ ہمارے لیے زادِ راہ اور آخرت میں مغفرت کا سامان پیدا کر سکیں۔

محترمہ فاخرہ پروین صاحبہ نے اپنے مضامین کے ذریعے پختہ رنگوں کی بہار لانے کا خواب دیکھا ہے، اور قلم کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ محترمہ فاخرہ پروین اپنے مضامین کے ذریعے اپنے احساسات اور جذبات کو کس قدر کھل کر سامنے لانے میں کامیاب ہوئی ہیں یہ فیصلہ تو پڑھنے والے ان کی کتاب کو پڑھنے کے بعد ہی کر پائیں گے۔

محترمہ فاخرہ پروین صاحبہ کے ادبی سفر کے لیے بھرپور دعائیں اور نیک خواہشات، ان کا ادبی شوق، لگن، جذبہ، محنت اور محبت اس بات کی طرف واضع اشارہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنا، اپنے والدین کا اور اپنے ملک کا نام روشن کرنے والی ہیں۔

دعاگو میاں وقارالاسلام،

پرنسپل کنسلٹینٹ مارول سسٹم،

فاؤنڈر وقارِ پاکستان

ماڈل بیسڈ گورننس

Model Based Governance

ہمارا مسئلہ جذوی نہیں کلی ہے

تحریر : میاں وقارالاسلام

مختلف فورمز پر پاکستان کے مسائل کے حوالے سے بات ہوتی رہتی ہے اور بہت سے لوگوں کا نقطہ ء نظر دیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ہمارا تعلیمی نظام ٹھیک نہیں، ہمارا ماحولیاتی نظام ٹھیک نہیں، ہمارا ٹریفک کا سسٹم ٹھیک نہیں، اداروں میں کرپشن ہے، پولیس اور عدلیہ ٹھیک نہیں اسی طرح ایک ایک کرکے ہر ادارے کے بارے میں یہی بات کی جاتی ہے کہ ہر جگہ سسٹمیٹک ایشیوز ہیں۔

جس طرح کے جزوی مسائل ہم سنتے ہیں اور ان پر بحث کرتے ہیں یا پھر ان پر اپنی رائے دیتے ہیں دراصل ہمارا مسئلہ سرے سے اس چیز کا نہیں ہے۔ ہماری کل عمارت جن بنیادوں پر کھڑی ہے وہ بنیادیں ہی ٹیڑھی ہیں اس لیے ہمیں عمارت کا ہر کمرہ ہر کونہ ٹیڑھا ہی نظر آئے گا اگر ہم عمارت کی بنیاد کو ٹھیک نہیں کریں گے ہمارے مسائل جوں کے توں ہی رہیں گے۔ ہم ایک ایسے درخت کی مانند ہیں جس کا تنا کمزور ہو چکا ہے اور اب کسی شاخ پر پھول اور پھل نہیں لگتے اور اگر ہم سب مل کر اپنے اس درخت کے تنے کو مضبوط نہیں کریں گے ہماری شاخوں پر کبھی پھول اور پھل نہیں لگیں گے۔

ہمارا نظام اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس میں رہتے ہوئے کوئی ادارہ بہتر پرفارم کرسکے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کوئی ادارہ اپنے پیٹی بھائی کو عبرت کا نشان نہیں بنائے گا بلکہ اس کا تحفظ کرے گا۔ جس سے ہر کرپٹ بندے کو پوری پوری تقویت ملے گی اور اگر کوئی ٹھیک بھی ہونا چاہیے گا تو اس طرح کے لوگ اسے واپس اپنے جیسا کرلیں گے۔ یہ ماننا کہ موجودہ سسٹم میں رہتے ہوئے اس نظام کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے یہ بات ایک دیوانے کا خواب تو ہو سکتی ہے مگر اس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

گن سے زیادہ وہ شخص اہم ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں گن ہوتی ہے۔ ہم ایک دہشت گرد کے ہاتھ میں گن پکڑا کر یہ کیسے توقع کرسکتے ہیں یہ کبھی امن بھی لا سکتا ہے۔ ہم ایک کرپٹ شخص کے ہاتھ میں اختیار دے کر یہ کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ کرپشن کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ پولیس والوں کو کیا

ڈر ہے کہ اگر وہ غلط کریں گے تو پکڑے بھی جائیں گے۔ یا عدالتیں جو فیصلے کرتی ہے وہ منوا تو لیے جاتے ہیں کیا واقعی ان کی ہیبت عوام کے دلوں میں بیٹھتی ہے کیا عوام واقعی پولیس اور عدلیہ کی کارکردگی سے راضی ہے۔ کیا آج بھی پولیس اور عدلیہ انہیں کے لیے فعال نہیں جن کے پاس پیسہ اور طاقت ہے۔

غریبوں کے حقوق کی بات کی جاتی تو کیا ہم سمجھتے کہ غریب کش انسانوں کے ہاتھوں میں اختیار دے کر غریب لوگوں کی محرومیوں کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے دودھ کی رکھوالی کے لیے بلوں کی فوج رکھی ہوئی ہے جو ہر روز سارا دودھ چٹ کر جاتے ہیں، بلے موٹے سے موٹے ہوتے جا رہے ہیں اور عوام اور ملک کی حالت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خیر میں مسائل پر زیادہ بات کرنے کا قائل نہیں ہوں، ہمارے بچے بچے کو پتا ہے کہ ہمارے کیا مسائل ہے اور سیاست دانوں سے بہتری کا سن سن کر ہمارے کان پک گئے ہیں اور بہتری کا خواب ایک بیہودہ نعرہ بن کر ہی رہ گیا ہے۔ تبدیلی نہ ہمارے بڑوں نے دیکھی نہ ہم نے دیکھی اور نہ ہی یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے بچے دیکھیں گے۔ کیوں کہ ابھی بھی ہم نے اپنی بنیادوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

ہم ایک جذباتی قوم ہیں اور بنیادی طور پر شخصیت پسند ہیں۔ ہم لوگوں سے اپنی توقعات جوڑ جوڑ کر انہیں دیوتا بنا دیتے ہیں اور جب ہماری خواہشات کا دیوتا ہمیں کچھ دینے سے قاصر رہتا ہے تو ہم اس سے ناامید ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بس اب یہ عبرت کا نشان بھی اور نیست و نابود ہو جائے اور ہمیں کوئی اور مسیحا ملے جس کی پوجا کر کے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

کاروباری دنیا میں اگر کوئی ادارہ ترقی کرتا ہے تو وہ ادارہ ترقی کرتا ہے جو اپنی بنیادیں بہتر کرتا ہے اور اپنے کاروبار کا ایک ماڈل بناتا ہے۔ اور پھر دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے کسی شخص کو اجازت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ادارے کے بنیادی ماڈل سے ہٹ کر کچھ کر سکے، سسٹم یا ماڈل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو یا تو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے یا پھر پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ٹھیک کام کرنے والے کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہوتی ہیں اور غلط کام کرنے والوں کے لے مشکلات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ وہ دوبارہ سے غلط کام کرنے کا نہیں سوچتا۔ مگر بیسک ماڈل ہی غلط ہو تو سب الٹا ہوتا ہے ہر غلط کام کرنے والے کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہوتی ہیں اور ہر درست کام کرنے والے کے لیے پریشانیاں ہی پریشانیاں ہوتی ہے کیوں کہ جب سمت ہی غلط ہو تو پھر جتنا بھی لمبا صفر کیوں نہ کر لیں منزل کبھی نہیں آتی۔

ہمیں ایک بہترین ریفائن نیشنل ماڈل کی ضرورت ہے جسے تمام ادارے کو لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑے اور اگر کوئی ادارہ یا فرد اس کے کسی بھی اصول کی خلاف ورزی کرے تو پھر اس کا جینا مشکل کر دیا جائے یہاں تک کہ اسے اپنی حالت درست کر کے واپس اسی ادارے میں آنا پڑے اور اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ ہو۔

پوری دنیا میں جہاں جہاں گڈ گورننس نظر آتی ہے اس کے پیچھے بنیادی سٹرکچر یہی ہوتا ہے کہ قومیں اپنے اصول وضع کرتی ہیں اور پھر جو کچھ بھی ہو جائے اپنے اصولوں پر سودا نہیں کرتیں اور اگر کوئی اصولوں پر سودا کرنے کی کوشش بھی کرتے تو اس کی ہر کوشش رائیگاں جاتی ہے کیوں کہ سسٹم میں اس کی اجازت کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح جن ملکوں میں ماڈل بیس ڈیویلوپمنٹس نہیں ہوتیں وہاں کا ہر بندہ ماڈل ہوتا ہے اور اس کی اپنی الگ ہی فلاسفی ہوتی ہے۔ یہ لوگ حب الوطنی کے نام پر اپنے دماغوں میں جو خلائی پلاو پکاتے رہتے ہیں اس کا نہ تو ان کو کوئی فائیدہ ہوتا اور نہ ہی کسی اور کو کوئی فائیدہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ بجائے اس کے کہ انفرادی سطح پر ہی ملک کی یا اپنی کوئی خدمت کر پائیں صرف نظام کا رونا ہی روتے رہتے ہیں۔ ان کی قسمت رونے سے شروع ہوتی ہے اور رونے پر ہی ختم ہوتی ہے نہ کوئی جینے کا مقصد نہ ہی کوئی مرنے کا مقصد بس راستے ہی بدلتے رہتے ہیں جب کہ منزل کا تعین کبھی بھی نہیں کر پاتے۔

ماڈل بیس اکانومیز میں راستے بھی واضح ہوتے ہیں اور منزل بھی صاف ہوتی اس لیے ہر شخص باآسانی اس میں اپنا حصہ ڈالتا رہتا ہے اور ملک ترقی کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں۔ اور یہ نہ دیوانے کا خواب ہے اور نہ ہی فینٹسی ورلڈ ہے۔ قوموں نے ایسے ہی ترقی کی ہے اور ایسے ہی ترقی کر رہی ہیں اور ایسے ہی ترقی کرتی رہیں گی۔ اور منہ دیکھنے والے منہ ہی دیکھتے رہیں گے نہ انھوں نے کچھ کیا ہے، نہ کر رہے ہیں اور نہ ہی کر سکیں گے جب تک کہ یہ خود اپنی حالت ٹھیک نہیں کر لیتے اور اپنی منزل اور راستے ایک نہیں کر لیتے۔

کوئی ولی تھا

تحریر : میاں وقارالاسلام

زندگی کتنی تیزی سے گزر جاتی ہے،
ہم کتنے قیمتی لوگ کھو دیتے ہیں۔

جب وہ پاس ہوتے ہیں تو ان کی قیمت کا اندازہ نہیں لگا پاتے
اور جب دور چلے جاتے ہیں تو ہم گزرے وقت کو سوچتے ہیں
کہ کاش ان کے ساتھ تھوڑا اور وقت گزارا ہوتا،
ان کی اور باتیں سنی ہوتیں انہیں اور محسوس کیا ہوتا۔

مگر وقت اپنا صفحہ بدل چکا ہوتا ہے اور زندگی کی کہانی اور موڑ لے لیتی ہے۔

کتنے ہی موڑ ہماری زندگی میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں،
اور پھر ایک وقت آتا ہے،
جب ہم زندگی کے آخری موڑ پر کھڑے ہوتے ہیں۔

ہم عجیب ہیں،
ہم اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں

جن سے ہماری زندگی کا خوشگوار پہلو منسلک ہی نہیں ہوتا،

ہم دشمنوں کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں،

ہم تکلیف دہ پہلوں کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔

ہم ایسے راستے اور ایسے لوگوں کا تعین نہیں کرتے

جن راستوں پر چل کر یا جن لوگوں کے ساتھ وقت گزار کر

ہماری زندگی زیادہ بامعانی اور زیادہ پر مسرت ہو سکتی ہے۔

زندگی اتنی تکلیف دہ نہیں،

جتنا تکلیف دہ اسے ہم خود بناتے ہیں

ہم کانٹے چنتے ہیں،

ہم زخم کریدتے ہیں،

ہم پھول کی طرف نہیں دیکھتے

ہم مرہم نہیں بنتے۔

ہم دکھ نہیں بانٹتے، ہم غم گسار نہیں بنتے،

ہم اس دنیا میں مصنوعی چیزیں ڈھونڈتے ہیں،

ہم اس دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھتے،

ہم نعمتوں کا شمار نہیں کرتے،
ہم نعمتوں کا شکرادا نہیں کرتے،
ہمیں جو ملتا ہے ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔

ہم خوشگوار زندگی گزارنے کے لیئے بہت محنت کرتے ہیں،
اتنی محنت کہ ہم اپنے کل کے لیئے اپنے آج کا سودا کرتے ہیں،
اور یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑتا ہے،
کل کبھی نہیں آتا اور ہم اپنا آج بھی کھو دیتے ہیں۔

اچھے کل کے لیئے ہمیں اپنا آج بہتر کرنا ہے،
جیسا ہمارا آج ہوگا ویسا ہی کل ہمارا استقبال کرے گا،
اور اگر ہم آج کی فکر نہیں کریں گے
تو ہمارا کل بھی ہماری فکر نہیں کرے گا۔

جو ہمارے پاس آنا ہے ہمیں اس کی اتنی قدر ہے،
کہ ہم اپنا آج بھی گروی رکھ دیتے ہیں،
اور جو ہمارے پاس ہے،
اس کی قدر ہم کتنی کرتے ہیں۔

زندگی کا ہر دن قیمتی ہے،
بچپن قیمتی ہے، جوانی قیمتی ہے
بڑھاپا قیمتی ہے، زندگی کے ہر دور قیمتی ہے،
صحت قیمتی ہے، دوست قیمتی ہیں،
رشتہ دار اور قرابت والے قیمتی ہیں
اور سب سے بڑھ کر وقت قیمتی ہے
اور وقت پر کر لیئے جانے والے کام قیمتی ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ ایک دوست تھا،
ایک سچا دوست، ہمیشہ کام آنے والا،
ہمیشہ ساتھ دینے والا اور شاید سب سے قیمتی سہارا
۔۔۔۔۔ جیسے کوئی مخلص ولی تھا

نہ آندھی آئی، نہ طوفان آیا،
نہ دل دھڑکا، نہ آنکھ جھپکی
بس اچانک سے زندگی نے اسے لاپتہ کر دیا۔

موت ایسی ہی ظالم چیز ہے،
بے خبری میں آ جاتی ہے

اور آنکھوں کے سامنے

منظر غائب ہو جاتے ہیں

اور ایسے لگتا ہے جیسے پوری دنیا لٹ گئی ہو۔

زندگی کے بہترین سے بہترین تعلق

ایسے لاتعلق ہوتے ہیں کہ

سالوں تک یقین نہیں آتا

ایسا لگتا ہے کہ ہماری روح کا وزن

کسی نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا

اور اچانک سے اپنے وجود کی لاش

دوگنے وزن کے ساتھ

اپنی ہی روح پر آ گرتی ہے

اور پھر سنبھالے نہیں سنبھلتی

سائے پیچھے ہٹنے لگتے ہیں

اور سورج سر پر چمکنے لگتا ہے

پھر دھوپ ہی دھوپ

اور ایسے ولی پھر نہیں ملتے

جو سر پر سایہ کیئے رکھیں

اس سے پہلے کہ ہنستی مسکراتی زندگی

بے سہارا ہو اور اپنے ولیوں کو ترستی پھرے

اپنے ارد گرد اپنے بہترین دوستوں کی قدر کریں

ان سے رشتے مضبوط کریں

اور زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ

ضائع ہونے سے بچائیں،

اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں،

خود بھی خوش رہیں

اور دوسروں کی خوشی کی وجہ بنیں

یقین مانیں یہ دنیا خوبصورت چمن ہے

اس سے پھول چنیں

اور کانٹوں کو نظرانداز کردیں

کانٹے سمیٹنے سے دامن چھلنی ہوتے ہیں،

جبکہ پھول سمیٹنے سے آپ کا دامن خوشبو سے بھر جاتا ہے،

اپنی تلخیاں بھی کم کرنے کی کوشش کریں

اور اپنے ارد گرد کے لوگوں میں بھی تلخیاں کم کریں۔

ہم سب نے بہت دوست کھوئے ہوں گے،

مگر جو ہیں ان کی قدر کریں

دعا گو، میاں وقارالاسلام

بیٹیاں بیٹیاں نہیں ہوتیں

بیٹیاں تو جان ہوتی ہیں

تحریر: میاں وقارالاسلام

اولاد اللہ تعالیٰ کا سب سے خوبصورت تحفہ ہے اور اس تحفے کی اہمیت کا اندازہ انسان کو تب تک نہیں ہوتا جب تک یہ انمول تحفہ اس کے ہاتھ میں نہیں دے دیا جاتا۔ اولاد بیٹا ہو یا بیٹی دونوں سے محبت والہانہ ہی ہوتی ہے۔ معاشرے کے بنائیے ہوئے اصولوں اور روایات کی وجہ سے یا کسی بھی دباؤ کی وجہ سے انسان اپنی سوچ کو کسی کے لیے تنگ یا کسی کے لیے کشادہ کر لے یہ ایک الگ بات ہے۔ مگر فطری تو پر اولاد تو اولاد ہی ہوتی ہے۔ پھر اولاد چاہے انسان کی ہو یا جانور کی فطری محبت ہمیں ہر جاندار جن کے جذبات سمجھنے کی ہم قدرت رکھتے ہیں ہم سمجھ سکتے ہیں۔

اب کسے بیٹیاں زیادہ پیاری ہیں اور کسے بیٹے اور اس کی کیا کیا وجوہات ہیں اس پر تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اپنے کچھ تجربات ضرور شئیر کر سکتا ہوں۔

شادی کے پانچ سال بعد جب مجھے اللہ نے بیٹا عطا کیا، تو اس وقفے کی وجہ سے اور پہلی اولاد کی وجہ سے محبت میں ایک فطری شدت تو تھی ہی مگر ایک ہی سال بعد جب بیٹی پیدا ہوئی تو محبت کی شدت نے اپنی نوعیت بدل لی۔ شاید غیر فطری طور پر جس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب مارکیٹ جاتے ہوئے میرے بیتے نے کچھ خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ پاپا یہ چیز لے لیتے ہیں یہ مریم کو بہت پسند ہے۔

میں نے حیرانی سے پوچھا کیوں کیا تمہیں یہ پسند نہیں۔ تو میرا بیٹا جس کا نام اسماعیل ہے وہ مجھ سے کہتا ہے کہ نہیں پسند تو مجھے بھی ہے۔ پھر میں نے مزید پوچھا کہ پھر تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ مجھے پسند ہے اور لے لیں۔ تو اسماعیل نے جواب دیا کہ جو مریم کو پسند ہوتا ہے وہ آپ ضرور لے لیتے ہیں۔

اُس وقت مریم کی عمر 4 سال تھی اور اسماعیل کی عمر 5 سال تھی اور اس نے اتنی چھوٹی عمر میں یہ محسوس کر لیا کہ میری محبت بیٹی کی طرف زیادہ ہے، شاید اس بات کا مجھے سرے سے اندازہ نہیں تھا مگر بچے بہت کچھ محسوس کرتے ہیں۔ اور بچے جھوٹ بھی نہیں بولتے۔

بیٹیاں ہوتی ہی ایسی ہے، کب محبت کا کتنا حصہ لے جاتی ہیں انسان سمجھ بھی نہیں پاتا۔ شاید ایسا بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ اللہ نے بیٹیوں کے لیے ہر انسان کے دل میں ایک الگ مقام رکھا ہے اور وہ چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے بیٹیوں کے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اب ہم غیر فطری طور پر اپنے آپ کو مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں یہ اور بات ہے۔

بیٹوں کی محبت بھی باپ سے کم نہیں ہوتی، مگر جو گرم جوشی اور ولولہ بیٹیوں کے دلوں میں ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں سے اور ان کے کام کاج سے چھلکتا ہے وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، میں جب گھر واپس آتا ہوں تو جتنے تپاک سے بیٹی کو آکر ملتے ہوئے دیکھتا ہوں یا پھر جو خوشی بیٹی کے چہرے پر باپ کے لیے کام کرکے محسوس ہوتی نظر آتی ہے وہ بیٹوں کے چہروں پر اتنی شدت سے نظر نہیں آتی، ایسا نہیں کے بیٹے باپ سے پیار نہیں کرتے مگر بیٹیوں کے دل شاید کچھ زیادہ ہی جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

بیٹیاں بہت جلد اپنے باپ پر ڈومینیٹ کر جاتی ہیں، اپنا حق بہت جلد تسلیم کروالیتی ہیں اور بیٹوں سے ایک قدم آگے رہتی ہیں۔ سب کا تو مجھے نہیں پتا مگر میری بیٹی کو تو یہ خوب آتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل جب میں سعودی عرب گیا اور وہاں میرا سٹے کچھ لمبا تھا تو ایک ماہ تک تو مریم نے برداشت کر لیا کیوں کہ وہ عادی ہو چکی تھی ایک ماہ تک انتظار کرنے کی کیوں کہ کام کے سلسلے میں اتنا وقت مجھے پہلے بھی باہر لگ جاتا تھا۔ مگر جب ایک ماہ سے زیادہ وقت گزرا تو اس نے مجھ سے فون پر بات کرنا چھوڑ دیا، کیوں کہ یہ اس کی برداشت کا آخری پڑاؤ تھا اور مجھے کہتی ہے کہ بات کرنی ہے تو گھر واپس آکر کریں۔ اتنا ہی وقت اسماعیل کو بھی ہو چکا تھا مگر دونوں کی محبت کی شدت کا فرق بہت محسوس ہوا بیٹیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے اس کے لیے کچھ تحفے وغیرہ بھجوائے اور اسے راضی کرکے پھر بات کرنا شروع کی۔

بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتیں ہیں جہاں آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ بیٹیوں کے دل میں آپ کی جان بسی ہوتی ہے۔ مریم کو تو اکثر بخار بھی ہو جاتا تھا، کھانا بھی چھوڑ دیتی تھی، فطری تڑپ تو بیٹا اور بیٹی دونوں میں ہی ہوتی ہے مگر بیٹیوں کا لگاؤ بیٹوں کی نسبت کتنا زیادہ ہوتا ہے یہ ہمیشہ با آسانی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حیرانی ہوتی ہے جب اتنے خوبصورت رشتوں کو ہم بدلے میں ناانصافی دیتے ہیں۔ یہ ناانصافی چاہے شادیوں کے معاملے میں ہو، تعلیم کے معاملے میں وراثت میں حصے کے معاملے میں ہو یا پھر لب و لہجے کے بارے میں ہو۔ یا پھر اس پھول کے بارے میں ہو جسے کھلنے سے پہلے مسل دیا جاتا ہے۔ یا پھر ان بھوکی نظروں کے بارے میں ہو جو عورت کو اپنی مستی کے سامان کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔

ہم عجیب ہیں، جو بیٹی باپ کے گھر کو جنت بنا کر رکھتی ہے، اسے جب پرائے گھر میں دبا دیا جاتا ہے تو پھر اس گھر کو کبھی بھی جنت نظیر نہیں بنایا جا سکتا۔ پھولوں کی چاشنی پھولوں کی آبیاری کرنے سے ہوتی ہے جب کہ پھولوں کے لیے ہوا، روشنی، پانی اور نرم مٹی فراہم نہ کی جائے تو پھول مرجھا جاتے ہیں اور سرسبز اور شاداب باغ بنجر بیابان کی عکاسی کرنے لگے ہیں۔

معاشرہ ہمیشہ عورت کے جسمانی خدوخال کی وجہ سے اسے کمزور یا کمتر سمجھتا ہے یا سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ شعور اور آگہی کی بنیاد پر عورت کو کبھی ہرایا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک تربیت یافتہ عورت ہزار مردوں پر بھاری ہو سکتی ہے۔ بہت سی خواتین ہیں جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی یا اپنی پسند کی فیلڈ میں کوئی بھی مہارت حاصل کی تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہزاروں بچوں کو تیار کر رہی ہوتی ہے یا پھر ہزاروں مردوں کی رہنما ہوتی ہے اور اداروں کو آگے لے کر چلتی ہے۔

اگر کسی مرد کو تعلیم اور مہارت کے حصول سے دور رکھ کر جاہل ہی رہنے دیا جائے تو اس سے بھی وہی نتائج حاصل ہوں گے جو نتائج ہم عورت کو تعلیم اور مہارت کے حصول سے دور رکھ کر حاصل کرتے ہیں۔

ایک کوالیفائیڈ لیڈی ڈاکٹر ہزاروں جعلی ڈاکٹروں سے بہتر خدمات سرانجام دیتی ہے اور معاشرے اپنا مقام بھی ہزاروں جعلی ڈاکٹروں سے بہتر رکھتی ہے۔ تو جسے ہم مسئلہ بناتے ہیں یا سمجھتے ہیں وہ مرد اور عورت کا ہرگز نہیں ہے مسئلہ تو ہے ہی علم اور آگہی کا اور شعور کا جو جتنا چاہے حاصل کر لے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اندھا اور آنکھ والا برابر ہیں ہو سکتے، یقیناً بالکل اسی طرح۔

کمزور اور لاچار انسان ہر میدان میں نشانہ بنتا ہے دہاتیوں کو شہریوں میں کوئی نہیں پوچھتا اور شہریوں کو بڑے شہروں میں کوئی نہیں پوچھتا مگر جو خود اعتمادی حاصل کر لے علم اور شعور حاصل کر لے اس کے لیے مشکلیں آسان سے آسان ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے چاہے دنیا کا کوئی بھی حصہ ہو دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر بکرا ہو یا بکری وہ تو پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ موقع پا کر حلال کر دیئے جائیں۔

یہ ضروری ہے کہ عورتوں کے پاؤں بھی ویسے ہی مضبوط کیے جائیں جیسے کہ ہم مردوں کے پاؤں مضبوط کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ عورتوں کی بھی ویسے ہی حوصلہ افزائی کی جائے جیسے ہم مردوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ تعلیم اور تربیت کے جو مواقع مرد کو ملتے ہیں وہی عورت کو بھی دیئے جائیں اور پیچھے اگر فرق کسی چیز کا رہ جائے تو وہ قابلیت، مہارت اور تعلیم کم سے کم یہ انسان کا بنیادی حق ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔

آج بھی معاشرے میں عورت کو ذمہ داری اور مرد کو ایسٹ سمجھا جاتا ہے۔ مگر بہت سی عورتوں نے مشکل حالات میں ثابت کیا ہے کہ وہ خاندان کا ایسٹ بن سکتی ہے۔ جب ہم شروع سے ہی عورت کو ذمہ داری سمجھ کر اسے تعلیم اور آگہی دیں گے تو آگے چل اس نے معاشرے کا ایسٹ کیسے بننا ہے یا پھر گھر کا ہی ایسٹ، ہم عورت کو ذمہ داری بنا کر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ظلم یہ کہ اکثر یہ ذمہ داری مشکل حالات میں عورت کے ہی سر ڈال دی جاتی ہے۔ پہلے بھی ظلم اور اس کے بعد بھی ظلم اور اس کے بعد نشانہ بھی اسے بنایا جاتا ہے کہ اگر یہ عورت ٹھیک ہوتی تو بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے۔

اگر مرد کو سوچ ٹھیک ہو جائے تو عورت مسائل نہیں وسائل پیدا کر سکتی ہے جیسے کہ دنیا میں عورتیں ہر میدان میں اپنے آپ کو منوا رہی ہیں اور بہترین انٹلیکچول وسائل کا متبادل ہیں۔

معاشرے میں روایات کا جو تسلسل ہے وہ اکیلے مرد کا بنایا ہوا نہیں ہے عورتیں بھی اس کی برابر حصے دار ہیں جس کے وجہ سے نہ مرد بدل سکتا ہے نہ عورت بدل سکتی ہے اور دونوں ہی معاشرے کی چکی میں پستے رہتے ہیں، ہمیں بہت سے ڈر ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم بہت زیادہ ٹوٹ جانے کے بعد جب کوئی رستہ ہی باقی نہیں رہتا تب کہیں جا کر رواج کا سامنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تب کچھ حاصل نہیں ہوتا اور مشکلیں اتنی بڑی ہو کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں کے ان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

ہم صرف ایک چیز کر سکتے ہیں، ماحول پیدا کریں، ماں کے لیے ماحول پیدا کریں، بیٹی کے لیے ماحول پیدا کریں، بہن کے لیے ماحول پیدا کریں بیوی کے لیے ماحول پیدا کریں اور خاندان کی عورتوں کے لیے ماحول پیدا کریں کہ تھوڑا ہو یا زیادہ جتنا ہو سکے علم حاصل کریں اور جتنا ہو سکے اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ اور مردوں کو چاہیے کہ اپنی آخرت خراب نہ کریں اور نہ ہی اپنی دنیا خراب کریں جہاں جہاں جتنا جتنا عورت کا حق ہے اگر اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تو جتنا ہو سکتا ہے اتنا اسے حق ضرور دیں۔

آخرت میں جس طرح نماز کا، روزے کا، ایمان کا اور باقی چیزوں کا حساب ہونا ہے بالکل اسی طرح عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ پھر بھی اگر کچھ نہیں دے سکتے تو کم سے کم اُسے وہ عزت تو دیں جس کی وہ حقدار ہے۔

اگر روش بدلی جائے تو یقیناً معاشرے کی شکل وہ نہیں ہو گی جو ہم آج دیکھتے ہیں اللہ سے ہدایت مانگیں کہ ہم ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکیں جس میں ہمارے انفرادی سلوک کی وجہ سے عورت کو اپنے کمتر ہونے کا احساس نہ ہو، دعا گو میاں وقار الاسلام

لاحاصل مہربان

تحریر: میاں وقارالاسلام

انسان جب پیدا ہوتا ہے، تو اس کے لیے سب سے مہربان ہستی اس کی ماں ہوتی ہے، پھر اسے جب اپنے باپ کی پہچان ہوتی ہے تو اسے اس میں بھی اپنا مہربان نظر آتا ہے، پھر اس کے بہن بھائی رشتے دار، آس پاس کے لوگ، یہاں تک کہ وہ گھر کے نوکروں سے بھی مانوس ہو جاتا ہے اور اسے اپنے بچپن میں ہی ایک چھوٹی سی مہربان دنیا مل جاتی ہے۔

پھر انسان کو شعور آنے لگتا ہے اور اسے لوگوں کی زیادہ پہچان ہونا شروع ہوتی ہے، انسان کو سمجھایا جاتا ہے کہ ہر پیار کرنے والا مہربان نہیں ہوتا، انسان کچھ لوگوں سے کم قریب ہوتا ہے اور کچھ لوگوں سے زیادہ قریب ہوتا اور یوں اس کے مہربان بانٹ دیے جاتے ہیں۔ پھر انسان کو سکول بھیج دیا جاتا ہے، وہاں اسے مہربان اساتذہ ملتے ہیں، مہربان دوست ملتے ہیں اور اسے ایک اور چھوٹی سی دنیا مل جاتی ہے، بہت سے اساتذہ اور بہت سے دوستوں کے درمیان بھی انسان کو بہت جلد یہ فرق محسوس ہونے لگتا ہے کہ کون اس پر زیادہ مہربان ہے اور کون اس پر کم مہربان ہے۔

وقت گزرتا چلا جاتا ہے انسان میں مذید شعور بیدار ہوتا ہے تو انسان اپنے فیصلوں پر غور کرتا ہے، کہ جو اسے زیادہ ڈانٹتے تھے وہ اس کے زیادہ مہربان تھے اور جو اسے کم ڈانٹتے تھے یا غلط ترغیب دیتے تھے، یا اکساتے تھے وہ اس کے کم مہربان تھے بلکہ ان میں سے تو کچھ اس کے دشمن بھی تھے جنہیں وہ ہمیشہ مہربان سمجھتا رہا۔ یوں تقسیم کا مزید سلسلہ جاری رہتا ہے اور انسان کے مہربان محدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پھر انسان اپنی تعلیم مکمل کرتا ہے اور اپنے لیے روزگار تلاش کرنے نکلتا ہے، یا نوکری کرتا ہے، یا پھر اپنا کوئی کاروبار کرتا ہے، یہاں بھی اسے اپنا پہلا مالک، یا کاروبار میں معاون شروع شروع کے لوگ اپنے محسن نظر آتے ہیں اور وہ انہیں اپنا مہربان سمجھنے لگتا ہے۔ مگر بہت جلد اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ لوگ مہربان کم ہی ہوتے ہیں اور اپنے مفاد کو سب سے پہلے ترجیح دیتے ہیں۔ بہت سے انسان جن پر دنیا کا رنگ چڑھنے لگتا ہے اسی طرح وہ بھی اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان اپنے رشتوں اور اپنے دوستوں کو مفاد پر تولنے لگتا ہے، ان لوگوں کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے جن سے اسے مالی فائدہ ہو اور ان لوگوں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے جن سے اسے کچھ خاص فائدہ نہ ہو۔ یہاں تک کہ اس کے پاس ماں باپ اور بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کے لیے بھی وقت کی کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔

مہربان وقت بھی ہمیشہ مہربان نہیں رہتا، یہ بہت سے مہربانوں کو ہم سے دور کر دیتا ہے، انسان جن ہاتھوں میں پرورش پاتا ہے جن کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتا ہے، جو اسے بولنا سکھاتے ہیں، یا جو اساتذہ اسے پڑھنا سکھاتے ہیں، یا جو انسان کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے رہنما رہے ہوتے ہیں، وہ ایک ایک کرکے جانے لگتے ہیں، انسان جو غموں سے آشنا نہیں تھا اس کی غموں سے آشنائی شروع ہو جاتی ہے، بہت سے قریبی رشتہ دار اس کی زندگی سے غائب ہو جاتے ہیں، بہت سے دوست جیتے جی اس سے دور ہو جاتے ہیں، اور بہت سے چاہنے والے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ تو انسان کے اندر ایک اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس کا کوئی مہربان ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

انسان جب اپنے بہت ہی قریبی لوگوں سے لاتعلق ہوتا ہے، یا پھر انہیں کھو دیتا ہے، یا پھر انہیں پا نہیں سکتا تو دکھوں اور غموں کا ایک سلسلہ اس کے اندر جنم لیتا ہے، کوئی اپنے حبیب کو یاد کرکے روتا ہے، کوئی اس کی جدائی میں شاعری کرتا ہے، کوئی اس کی تصویریں بناتا ہے، کوئی اس کے لیے تاج محل بناتا ہے اور کوئی خود غم کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک سے ایک غم کا پہاڑ انسان کے سر پر ٹوٹتا ہے، کسی کی ماں چلی جاتی ہے، کسی کا باپ چلا جاتا ہے، کسی کے بھائی اور بہن اس کے ساتھ نہیں رہتے اور کسی کے رشتے ناتے جیتے جی بے وفا ہو جاتے ہیں یا پھر بے نام ہو جاتے ہیں۔

انسان جنہیں مہربان سمجھتا تھا، وہ تمام مہربان یا تو وفات پا گئے، یا بے وفائی کر گئے، یا اپنا مطلب پورا ہوتے ہی الگ ہو گئے، یا انسان کی اپنی مطلب پرستی نے انہیں کھا لیا، اور یوں انسان اکیلا ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر تنہائی اسے کھانے لگتی ہے۔ اور وہ اپنے مہربانوں کو یاد کرکے روتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس سے اس کا اکیلا پن بانٹا جائے۔ اور انسان اپنی تنہائی سے ڈرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کے اس کے ارد گرد بہت سے لوگ ہوتے ہیں، بڑی شان و شوکت ہوتی ہے مگر انسان کو اب اپنی مطلبی رفاقتوں سے الجھن ہونے لگتی ہے، اب اسے مطلبی لوگ نہیں چاہیں، اسے اپنے بچپن کے دوستوں کی طرح بے لوث دوست چاہیں، اپنے بچپن کے رشتہ داروں کی طرح ڈانٹنے والے چاہیں، اسے مہربان رشتے چاہیں، انسان بہت مضبوط ہونے کے بعد بہت کمزور ہونے لگتا ہے۔ انسان کے سامنے اس کے اپنے بچے بڑے ہو رہے ہوتے ہیں، وہ بچے جنہیں اس نے اپنے ہاتھوں میں پالا پوسا بڑا کیا ان کی چھوٹی چھوٹی ہر ضرورت کا خیال رکھا، مگر جیسے ہی وہ بڑے ہوئے وہ اپنے آپ میں مصروف ہو گئے، جن بچوں کو والدین نے مہربان بن کر دکھایا، ان پر شفقت کا سایہ کئے رکھا انہیں بچوں میں والدین اپنا مہربان تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بچے اچھے بھی ہوتے ہیں فرمابردار بھی ہوتے ہیں مگر جس طرح کی شفقت انہیں ماں باپ دیتے ہیں بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ اسی طرح کی شفقت اور مہربانی انہیں اپنے بچوں سے مل جائے۔ ایک طرف انسان کو اس کا بڑھاپا کھائے جا رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے اس کے کے بچوں کی خود سر جوانی کھائے جا رہی ہوتی ہے۔

جن بزرگوں کی وجہ سے گھروں میں چہل پہل تھی، میلوں کا سماں رہتا تھا، وہ اپنی کمزوری اور بڑھاپے کی وجہ سے بہت محدود ہو جاتے ہیں۔ گھروں میں پہلے جیسی چہل پہل نہیں ہوتی، جو مہربان اور دوست آتے ہیں وہ بچوں کے مہربان اور دوست ہوتے ہیں، اور بزرگوں کے جاننے والے پہلے تو کم ہی زندہ رہ گئے ہوتے ہیں اور اگر کہیں کوئی زندہ بھی ہوتے ہیں تو وہ بھی اپنے اپنے گھروں میں ویسے ہی محدود ہو جاتے ہیں جیسے وہ خود محدود ہو گئے ہوتے ہیں۔

انسان سوچتا ہے کہ اسکے بہت سے رشتہ دار تھے، بہت سے تعلق دار تھے، بہت سے دوست تھے بہت سے قرابت والے تھے سب کے سب کیا ہوئے، وہ مطلب پرست کہاں گئے، کوئی مطلب پرست ہی آ جاتا، مگر نہیں، انسان جیتے جی کتنا تنہا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو ایک غیر ضروری چیز سمجھنے لگتا ہے۔

کچھ لوگ زندگی کو ایسے نہیں جیتے، جس طرح کی منظر کشی میں نے اوپر کی ہے، بلکہ کچھ لوگ شروع سے ہی ایمان لے آتے ہیں کہ ان کا مہربان لاحاصل نہیں، دنیاوی نہیں، خون کے رشتوں سے بندھا ہوا نہیں اور وقتی نہیں، ان کا مہربان صرف ایک ہی ہے، جسے کوئی مطلب نہیں، جسے کوئی غرض نہیں اور جو کسی بھی حال میں ان کا ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔ نہ ہی وہ دنیا میں انہیں اکیلا کرے گا اور نہ ہی انہیں آخرت میں اکیلا کرے گا۔

جو لوگ اپنے مالک سے، اپنے رب سے، اپنے خدا سے جڑے ہوتے ہیں، وہ دنیا میں کبھی تنہائی کا شکار نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ صبر اور شکر سے کام لیتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کا مہربان انہیں چھوڑ کر جانے والا نہیں، خود غرض نہیں، کمزور نہیں، مطلب پرست نہیں، بلکہ ان کا مہربان ہمیشہ رہنے والا ہے اور موت اور بیماری سے پاک ہے، وہ رشتہ داریوں اور تعلق داریوں سے پاک ہے، وہ مجبور نہیں، وہ محتاج نہیں، اس کی بادشاہی کبھی ختم ہونے والی نہیں، اس کا فضل اور اس کی مہربانی کبھی کم ہونے والی نہیں، ان کا مہربان ہمیشہ سننے والا ہے، ہمیشہ دیکھنے والا ہے، ہمیشہ سنبھالنے والا ہے۔

کمزور مہربانوں کے سہارے انسان نہ زیادہ دیر کھڑا رہ سکتا ہے نہ زیادہ دور تک چل سکتا ہے۔ اور اگر مہربان کمزور ہو تو انسان کا سہارا بھی کمزور ہوتا ہے، جب مہربان ٹوٹتے ہیں تو انسان بھی ٹوٹ جاتا ہے، جب مہربان مرتے ہیں تو ادھا انسان بھی مر جاتا ہے۔ تو ساتھ کس کا بہتر ہے اور سہارا کس کا اچھا ہے۔ انسان جتنا جلد اپنی اس حقیقت کو سمجھ لے اور اپنے رب کی طرف رجوع کر لے اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے اور اتنا ہی اس کے لیے دنیا اور آخرت میں فائدہ مند ہے۔ باطل سہارے اور باطل مہربان انسان کو توڑتے چلے جاتے ہیں اور انسان کے پاس سوائے مایوسیوں کے اور کچھ نہیں بچتا، تو سہارا تو اسی کا لینا چاہیے جو لائق حمد و ثنا ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، رب کے سوا تمام مہربان لاحاصل

ہیں، ہم نے اکیلے اکیلے مرنا ہے اور اکیلے اکیلے ہی اپنی قبروں سے اُٹھنا ہے اور ہم اپنے حقیقی مہربان کے سامنے اکیلے اکیلے ہی پیش ہوں گے۔ سہارا اسی کا لینا چاہیے جو آخرت میں ہمارا سہارا بن سکے۔

اے اللہ، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد مانگتے ہیں، اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹ کر آنا ہے، دعا گو میاں وقار الاسلام

OVER PAMPER

اوور پیمپر

ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار

تحریر : میاں وقارالاسلام

فرض کریں آپ کے دو بچے ہیں، ایک بچے کو آپ دنیا جہاں کی سہولیات فراہم کریں اور دوسرے بچے کو ضروریات کے مطابق سہولیات فراہم کریں۔ اور اس طرح دونوں کی پرورش ہوتی رہے۔ ایک کی آپ ہر طرح سے خدمت کریں اور اسے واپس خدمت کرنا نہ سکھائیں اور دوسرے اپنے کام بھی خود کرنے پڑیں اور حسب ضرورت آپ کے کام بھی کرنا پڑیں اور یوں زندگی کا سفر جاری رہے۔

اب اللہ نہ کرے کہ آپ پر کوئی مشکل وقت آئے۔ پر اگر ایسا ہو تو کون آپ کہ بہتر مدد کر پائے گا وہ جسے آپ نے اوور پیمپر کیا یا وہ جسے آپ نے کم پیمپر کیا آپ میں سے اکثر یہی کہیں گے کہ جسے کم پیمپر کیا گیا وہ زیادہ مدد کرے گا مگر ایسا کیوں ہوتا ہے جسے ہم نے اوور پیمپر کیا مدد تو اس کو کرنی چاہیئے تھی۔

ہوتا یوں ہے کہ اوور پیمپر کرنے کی وجہ سے ہم نے ایک بچے کو بالکل ہی مفلوج کر دیا اب اسے کام لینا تو آتا ہے مگر کام کرنا نہیں آتا۔

ہمارے معاشرے کی اپر کلاس میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اوور پیمپر ہیں چاہیئے وہ سرکاری اداروں میں ہوں یا پھر نجی اداروں میں یا پھر وہ ہمارے انتہائی اعلی تعلیمی اداروں کے بچے ہوں اوور پیمپرینگ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اور ہمارے قومی اداروں کو ایسی بہت سی زندہ لاشیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔

ہم نے ضرورت سے زیادہ اوور پیمپر وائیٹ کالرز تو پیدا کر دیئے ہیں مگر حسب ضرورت بھی بلو کالرز پیدا نہیں کیئے۔ ہمارے ہر گریجویٹ کو بڑی ٹیبل، بڑی کار اور بڑا گھر تو چاہیئے مگر کام کرنے کی کیپیسٹی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

چائنہ کے ٹاپ کوالیفائیڈ انجینئرز یا ایگزیکیٹو ملٹی ٹاپ کام کرنے میں بالکل نہیں ہچکچاتے جبکہ ہمارے عام سے گریجویٹس میں بڑی سطح پر کام نہ کرنے کا فقدان پایا جاتا ہے۔

بہت سی کارپوریٹ ٹریننگز لائف سکیلز یا کیپیسٹی بلڈنگ کے حوالے سے کروائی جاتی ہیں جن کا مقصد صرف کام کے حوالے سے رویوں کی تبدیلی اور موٹیویشن ہی ہوتا ہے۔

منفی رویئے اور موٹیویشن کا فقدان ہمارے کلچر میں موجود ہے اور ہم میں ایک دوسرے سے سرائیت کر جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سست جمع سست برابر سست

ویسے ایک اور قوم کی سستی دیکھ کر میں اپنی قوم کی سستی بھول گیا اور وہ ہے دنیا کی سب سے اوور پیمپر قوم جو بڑا عرصہ بلیک گولڈ سے نہلاتی رہی اور آج کل بلیک دور سے گذر رہی ہے اور اپنی سستیوں کے ختم کرنے کے لیئے بہت زیادہ جستیاں دیکھا رہی ہے۔

شہزادوں کا مزاج تو چلیں سمجھ میں آتا ہے مگر ہم اپنا 200 سالہ پرانا نوابی اور راجہ مہاراجہ یا پھر مغلوں والا مزاج کب بدلیں گے

آدھی ادھوری عیدیں

تحریر: میاں وقارالاسلام

عید خوشی کا تہوار تو ہے، مگر یہ غم کی شدت بھی بڑھا دیتا ہے۔ بہت سے زخموں کو تازہ کر دیتا ہے۔ لگتا ہے جیسے کوئی چیز زخموں کو کریدتی ہی چلی جا رہی ہو۔

زندگی آنی جانی ہے، یہ دنیا کب لافانی ہے، کسی نے دوست اور رشتہ دار کھوئے ہوں گے، کسی نے بھائی بہن کھوئے ہوں کے کسی کا لخت جگر دور ہو گیا ہو گا کی کی ماں اور کسی کا باپ خالق حقیقی سے جاملا ہو گا۔ کسی کا شوہر نہیں رہا کسی کی بیوی نہیں رہی یا پھر کسی کا کوئی اور قربت والا ہمیشہ کے لیے اکیلا کر گیا ہو گا۔

جب عید آتی ہے تو بچھڑنے والے چاہے بہت پہلے بچھڑے ہوں یا پھر ماضی قریب میں ان کی غیر موجودگی دل کے آنگن کی ویرانی کو باہر لے آتی ہے۔ باوجود بہت سے تعلق داریوں اور رشتہ داریوں کے ان کی کمی اپنی جگہ مکمل طور پر قائم رہتی ہے۔

بہت سے مسکراتے ہوئے چہرے، رنگ برنگے پیراہن، اور عید کی مبارکبادیں گویا غموں کی شدت کو ساتویں آسمان تک لے جاتی ہیں، نہ بندہ پھوٹ کر رو سکتا ہے نہ کھل کر دل کی کیفیت بیان کر سکتا ہے بس جدائی کا غم پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر بیٹھ جاتا ہے۔

جب کوئی عید مبارک کہتا ہے تو یوں لگتا ہے کسی نے غموں کے تار چھیڑ دیئے ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے آنکھوں پر مصنوعی خوشی کا احساس رکھنا اور دل کے نہ رکنے والے آنسوں کو صاف کرتے رہنا۔ اور اسی عجیب سی کشمکش میں عید ہلکان کرتے کرتے گزر جاتی ہے۔

عید کی خوشیاں بہت سے لوگوں سے جڑی ہوتی ہیں، گویا موتیوں کی ایک لڑی ہوتی ہے، جب یہ لڑی ٹوٹنے لگتی ہے تو پھر خوشیوں کے موتی بھی بکھرنے لگتے ہیں، ایسا نہیں کہ ارد گرد محبت کرنے والے کم ہوتے ہیں، جسم چاہے پورا سلامت ہو ذہن اسی طرف ہی جاتا ہے جس جگہ چوٹ لگی ہوتی ہے۔ بس ایسا ہی کچھ احساس کہ زخموں کے مہانے اپنے ہونے کا شدید احساس دلانے لگتے ہیں۔

دل صبر اور شکر کا مطلب سمجھ چکا ہوتا ہے، لوگوں کے دلاسے بھی کام کر جاتے ہیں انسان اوپر اوپر سے پتھر بھی ہو چکا ہوتا ہے۔ مگر عید کے آتے ہی پتھر پھوٹ پڑتے ہیں اور ان میں نہ نظر آنے والے آنسوؤں کے کئی چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

عجیب غم ہیں جو کبھی نہیں جاتے، گئے دنوں کی یادیں کبھی نہیں بھولتیں، جدا ہونے والے کبھی الگ نہیں ہوتے۔

عیدیں شاید بچھڑنے والے سے ملانے چلی آتی ہیں، ایک ایک یاد تازہ ہونے لگتی ہے، بچھڑنے والا کیسے ملنے آتا تھا، کیسے بلاتا تھا کیسے بات کرتا تھا، کیسے غمگساری کرتا تھا، کیسے دل بہلاتا تھا، اس کا ہونا کس قدر اہم تھا اور اس کا نہ ہونا کس قدر تکلیف دہ ہے، کاش وہ اب بھی ساتھ ہوتا، کچھ دن اور کچھ پل اور اتنا جلدی نہیں جانا چاہیئے تھا اس کے بغیر کسی چیز کا لطف نہیں عجیب سا خالی پن عجیب سے آدھی ادھوری عیدیں۔

شاید زندگی ہے ہی آدھی ادھوری، ہمیں اسے بہت سے قیمتی لوگوں کے بغیر جینا پڑتا ہے، ان کی یاد میں تڑپنا پڑتا ہے اپنے دل کو بہلانہ پڑتا ہے اور جینے کے بہانے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اور یہی زندگی کا بنیادی فلسفہ ہے۔

ہمیں بہت کم میں خوش رہنا ہے، ہمیں بہت تھوڑے پر گزارا کرنا ہے۔ اسی پر ہمیں صبر اور شکر کرنا ہے۔ ہم ایسے ایسے رشتوں میں کھو جاتے ہیں اور دل ایسے ایسے تعلقات سے مانوس ہو جاتا ہے کہ زندگی کا تصور بھی ان کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے مگر اللہ ہماری خواہشات کے مخالف اس دنیا کو چلاتا ہے۔

جو ہو نہیں سکتا وہ ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک غم جو ہم سے برداشت نہیں ہوتا ایسے کئی غم ہمارے سروں سے گزر جاتے ہیں۔ جس آسمان میں کئی ستارے ہوتے ہیں ان میں سے چند آگے پیچھے ہو جائیں تو آسمان خالی ہو جاتا ہے چاہے اسے پھر اتنے ہیں ستاروں سے بھر دیا جائے۔

آج ہم کسی کے لیئے رو رہے ہیں کل کوئی ہمارے لیئے رو رہا ہوگا اور یہ دنیا ایسے ہی چلتی چلی جائے گی۔ ہمیں جانے والوں کی قدر و قیمت کا احساس تو ہوتا رہے گا، مگر جو لوگ ہم میں موجود ہیں انہیں ہم شاید بے وقت کرتے رہیں گے۔

جو چلے گئے وہ بھی بہت قیمتی تھے اور جو موجود ہیں وہ بھی بہت قیمتی ہیں بعد میں رونے سے آج کا خوش رہنا اہم ہے، خوش رہیئے خدا جانے ہمیں زندگی نے اور کتنا آزمانا ہے کیا معلوم ہمیں کون کون سے دکھ اٹھانے ہیں۔ مگر زندگی نے نہیں رکنا، زندگی کو چلنا سکھایا گیا ہے اس نے چلتے ہی رہنا ہے نئے لوگوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہنا ہے اور بچھڑنے والوں نے بچھڑ ہی جانا ہے۔

اے اللہ ہمیں صبر کرنے والوں میں شامل رکھنا۔۔۔ آمین

بیسٹ کوٹس اینڈ بیسٹ کمنٹس

انتخاب : ہالہ ارشد

عنوان : ہم لکھنے والے

تحریر : میاں وقارالاسلام

ہم لکھنے والے، جانے غم لکھنے والے، انجانی خوشیاں لکھنے والے، چشمِ پُرنم لکھنے والے، رنگوں اور خوشبوؤں کو قید کرنے والے، بادلوں اور بارشوں سے متاثر ہونے والے۔ ہم حساس، ہم نازک، ہم صابر، ہم مضبوط، ہم بے لوث، ہم محبت سے بھرپور۔ ہم غمگسار، ہم خود سے شرمسار، ہم عاصی، ہم گناہ گار، اپنی کوتاہیوں پر رونے والے، ہم دوسروں کے غموں پر بھی غمگیں۔ ہمیں سب کو خوش کرنے کی خواہش، اور ہمیں سے بہت سے پرائے اپنے خفا۔ شاید لکھتے لکھتے ہم ایک کھلی کتاب بن جاتے ہیں، تو لوگوں کا ہم پر بات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

عنوان : آدھی ادھوری عیدیں

تحریر : میاں وقارالاسلام

عیدیں شاید بچھڑنے والے سے ملانے چلی آتی ہیں، ایک ایک یاد تازہ ہونے لگتی ہے، بچھڑنے والا کیسے ملنے آتا تھا، کیسے بلاتا تھا کیسے بات کرتا تھا، کیسے غمگساری کرتا تھا، کیسے دل بہلاتا تھا، اس کا ہونا کس قدر اہم تھا اور اس کا نہ ہونا کس قدر تکلیف دہ ہے، کاش وہ اب بھی ساتھ ہوتا، کچھ دن اور کچھ پل اور اتنا جلدی نہیں جانا چاہیئے تھا اس کے بغیر کسی چیز کا لطف نہیں عجیب سا خالی پن عجیب سے آدھی ادھوری عیدیں۔

عنوان : سیاہی سے روشنائی تک

تحریر : میاں وقارالاسلام

لوگوں کی آہ سنیں، لوگوں کے غمگسار بنیں مگر لوگوں کی تکلیفوں کو سرعام بیچ کر سستی شہرت کے پجاری نہ بنیں، سستی شہرت آپ کو دنیا میں شاید مشہور کر دے مگر یہ آخرت میں آپ کی جان کا وبال بننے والی ہے۔ لوگوں کے حوصلے پست کرنے میں اپنا حصہ نہ ڈالیں، یہ کام تو شیاطین کرتے ہیں، نہ جانے قلمکاروں کے ٹولوں کی ایک بستی کو کیا ہوا ہے، دیمک لگ چکی ہے شاید۔ تو پڑھنے والوں کو بھی چاہیے کہ ایسے بیمار ذہنوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں، انہیں یقینا علاج معالجے کی ضرورت ہے۔

عنوان : پختہ رنگوں کی کہانیاں

تحریر : میاں وقارالاسلام

کہانی ایک ہو یا ہزاروں، انجام اچھا ہو یا برا، لوگ تعریف کریں یا نہ کریں شاید فرق صرف ایک ہی چیز سے پڑے گا کہ ہزاروں کہانیاں رکھنے والا یہ انسان اپنی زندگی کے اصلی کہانی کیسے لکھ کر آیا ہے۔ کیا اس کی زندگی کی اصلی کہانی اتنی دلچسپ اور حسین ہے کہ اس کی مغفرت کروا سکے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں جو رنگ بھرتے ہیں، ان رنگوں کی حقیقت اللہ کے ہاں کیا حیثیت رکھتی ہے ایسا نہ ہو کہ بے بہار نگوں سے سجی سجائی زندگی جب اپنا حساب دینے پر آئے تو اس کے سارے رنگ ہی اُڑ جائیں۔

عنوان : میں ابھی زندہ ہوں

تحریر : میاں وقارالاسلام

کچھ لوگ زندگی میں ایسے آتے ہیں جیسے کہ بہار آتی ہے، بادل آتے ہیں، بارش ہوتی ہے پھول کھلتے ہیں، ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیل جاتی ہے اور پھر ایک خلا رہ جاتا ہے۔ ایک میسج آئے گا، آپ ٹھیک ہیں، آپ کے بچے ٹھیک ہیں، آپ کا کام ٹھیک چل رہا ہے، بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی تھی، میں نے سوچا آپ کی خیریت معلوم کروں اور یہ بھی کہ بتاؤں کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اور پھر کوئی آپ کو بتائے گا، کہ وہ اب ہم میں نہیں۔ زندگی ہے یا کہ کوئی مذاق، ایک دن آئے گا، یہ مذاق ہو جانا ہے۔ کسی کے لیے سب رہ جائے گا، کسی کے لیے سب ختم ہو جائے گا۔

عنوان : کوئی ولی تھا

تحریر : میاں وقارالاسلام

اس سے پہلے کہ ہنستی مسکراتی زندگی بے سہارا ہو اور اپنے ولیوں کو ترستی پھرے، اپنے ارد گرد اپنے بہترین دوستوں کی قدر کریں ان سے رشتے مضبوط کریں اور زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ضائع ہونے سے بچائیں، اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں، خود بھی خوش رہیں اور دوسروں کی خوشی کی وجہ بنیں۔ یقین مانیں یہ دنیا خوبصورت چمن ہے اس سے پھول چنیں اور کانٹوں کو نظر انداز کر دیں۔ کانٹے سمیٹنے سے دامن چھلنی ہوتے ہیں، جبکہ پھول سمیٹنے سے آپ کا دامن خوشبو سے بھر جاتا ہے

عنوان : ابلیس نے ٹھیک کہا تھا
تحریر : میاں وقارالاسلام

ابلیس نے ٹھیک کہا تھا تیرے بندوں پر میرا زور نہیں چلے گا۔ یقیناً ابلیس کی اوقات ہی نہیں کہ اللہ کے بندوں پر اپنا زور چلا سکے۔ مانا کہ حج اور عمرہ صرف اُنہیں کیلئے ہے جو صاحبِ حیثیت ہیں اور حرم تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مگر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو بے حیثیت لوگ باحیثیت ہو جاتے ہیں۔ غریب، بوڑھے، لاچار، کمزور لوگ دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں حرم پہنچ جاتے ہیں، یقیناً شیطان اپنی بے بسی پر روتا ہوگا کہ جن لوگوں کو اس نے ساری زندگی اپنی ابلیسی زنجیروں سے جکڑے رکھا انہیں جب بھی اللہ کا حکم ہوا کسی نے بھی ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں کی اور اللہ پاک کے گھر پہنچ گئے۔

عنوان : دنیائے حرم
تحریر : میاں وقارالاسلام

دنیائے حرم کو سلام ہے، حرم اس زمین کا ایسا روشن ٹکڑا ہے جو کہیں اور دیکھنے کو نہیں مل سکتا۔ دنیائے حرم اللہ کی تجلّیوں سے آباد ہے اور یہ ایسا نور ہے کہ روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔ جن آنکھوں نے ہمیشہ اندھیرا ہی دیکھا ہو وہ یہاں آتے ہی چُندھیا سی جاتی ہیں، دیر سے ہوش آتا ہے کہ گناہگار بندے کے ساتھ معاملہ کیا پیش آیا۔ لوگ حرم سے ہو کر تو چلے جاتے ہیں مگر ایک عجیب سی تڑپ آپ کی روح میں اتر چکی ہوتی ہے

عنوان : اِنسان باکمال خالق کی باکمال تخلیق
تحریر : میاں وقارالاسلام

پوری دُنیا کے انسان مل کر بھی ایک اِنسان کا احاطہ نہیں کر پائے، اِنسان کے جسم کے ایک ایک پور پر تحقیق جاری ہے۔ اتنے نایاب حضرتِ انسان کو ہم بے وقعت کیسے کر دیتے ہیں، انسان کے پورے وجود میں جو اس کا دل ہے اس کی اہمیت مرکزی ہے، دل کو وہ کمال حاصل ہے کہ وہ جسم جس حصے تک خون کی سپلائی بند کر دے وہ حصہ مردہ ہو جاتا ہے۔ اتنا طاقتور دل جس کے بھروسے پر انسان پوری زندگی گزار دیتا ہے، اس کی حقیقت دیکھی جائے تو اس کا ٹوٹنا ایک معمولی سے لمحے کی بات ہے، ایک چھوٹا سا جھٹکا اور بس اس کی ساری طاقت ختم، ہر دِل اللہ کے حکم سے دھڑکتا ہے، جس دن حکم ختم اس دن دِل کی دھڑکن بند۔

عنوان : محبت میری نظر میں

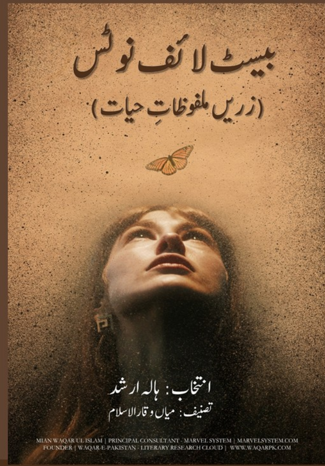
تحریر : میاں وقار الاسلام

میری نظر میں محبت ایک قرض ہے۔ جہاں سے محبت نصیب ہو وہاں اسے کم از کم اس کی قدر کے مطابق واپس بھی لوٹانا چاہیے، حالانکہ محبتوں کے قرض پوری طرح اتارے نہیں جا سکتے۔۔ مُحبت کا قرض مُحبت سے ہی اُتارا جا سکتا ہے جیسی ہمیں جس جس سے مُحبت ملی ویسی ہی مُحبت ہمیں اُن سب کو واپس بھی دینی چاہئے۔ اور اگر اللہ پاک کا فضل ہمارے ساتھ نہ ہو تو ہمیں کچھ بھی نصیب نہ ہو اللہ پاک اپنے بندوں سے بہت زیادہ مُحبت کرتا ہے تو سب سے زیادہ مقروض اس ہستی کے ہیں جس نے ہمیں تخلیق کیا سو ہمیں اپنے خالق کی مُحبت کا قرض اس سے اور اس کے لوگوں سے مُحبت کر کے اُتارنا چاہئے۔



مادرِ دبستانِ لاہور، ڈاکٹر شہناز مزمل
چیئر پرسن، اَدب سرائے اِنٹرنیشنل

یہ بیسٹ لائف نوٹس (زریں ملفوظاتِ حیات) جس کا سِلسِلہ میاں وقارالاسلام نے شروع کیا، اور بہت سے لوگ اُس میں شامل ہوئے اور مجھے بھی اِس میں شامل ہونے کا موقع حاصل ہوا اور میرا اِظہارِ خَیال اور اِنتخاب بھی اِس میں شامل ہے اور اَب یہ اِنتخاب ہالہ ارشد نے بھی کیا ہے اور اُنہوں نے بھی اِس کو باطریقِ احسن نَبھانے کی کوشش کی ہے، اور اِس میں بہت اچھے طریقے سے مُنتخب کرکے ترتیب دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اِن کی یہ کوشش کامیاب کریں اور اِسی طرح سے لوگ لکھنے سے پہلے اِنتخابات کرتے رہے تاکہ خود بھی لکھنا سیکھ لیں، اور اِس میں اَدب کے میدان میں آگے آگے اور آگے بڑھتے رہے، مجھے اُمید ہے کہ ہالہ ارشد نے اِس سے بہت کچھ سیکھا ہوگا اور اَب یہ اپنی لکھی ہوئی کتاب مَنظرِ عام پر لائیں گی انشاء اللہ، میں اِن کیلئے بہت سی دُعا کرتی ہوں، بہت سی دُعائیں اور بہت سا پیار۔



مختصر تعارف

نام: ہالہ ارشد، سکول ٹیچر (اردو، اسلامیات، کمپیوٹر)، سٹوڈینٹس کوچنگ، سٹوڈینٹس کونسلنگ۔

فری لانسنگ: کانٹینٹ رائٹنگ اردو اینڈ انگلش، ڈیجیٹل مارکیٹنگ،

تعلیم: میٹرک (سائنس)، آئی کام (اکاؤنٹس)، بی اس اسلامک سٹڈیز،

سرٹیفکیشنز: ایم ایس آفس، ایم ایس ونڈوز، سوشل میڈیا مارکیٹنگ،

ایوارڈز: کنٹریبوشن اینڈ پارٹیسپیشن سرٹیفکیٹس (علمی وادبی)

بیسٹ لائف نوٹس (زریں ملفوظاتِ حیات)

1 تعارفی اور اعزازی

2 اسلامی اور مذہبی

3 ثقافتی اور سماجی

4 تجارتی اور معاشی

5 علمی اور تربیتی

6 ادبی اور لسانی

7 سیاسی اور حکومتی

8 غیر ملکی اور بین القوامی

9 ذہنی اور نفسیاتی

10 اصلاحی اور تنقیدی

بیسٹ لائف نوٹس
انتخاب: ہالہ ارشاد

بیسٹ لائف نوٹس
مصنف: میاں وقارالاسلام